متحدہ مجلس عمل

توقعات اور کارکردگی

ابوعمار زاہد الراشدی

الشریعہ اکادمی

کتاب: متحدہ مجلس عمل: توقعات اور کارکردگی
ناشر: الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ
فون: 055-4271741 / 4000394
aknasir2003@yahoo.com
اشاعت اول: اگست ۲۰۰۷
قیمت: روپے

فہرست

متوقع ترجیحات اور حکمت عملی

ملک بھر کے دینی کارکنوں اور علماء کرام سے اپیل

پاکستان شریعت کونسل کا انتخابی سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کے قیام کے ساتھ واضح کر دیا گیا تھا کہ انتخابی سیاست اور اقتدار کی کشمکش سے الگ تھلگ رہتے ہوئے پاکستان شریعت کونسل ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ، دینی قوتوں میں رابطہ ومفاہمت کے فروغ اور اسلام مخالف لابیوں اور سرگرمیوں کے تعاقب کے لیے فکری اور علمی محاذ پر کام کرے گی چنانچہ اسی دائرہ میں رہتے ہوئے کونسل اپنے وسائل اور استطاعت کے دائرہ میں سرگرم عمل ہے اس کے ساتھ ہی اعلان بھی کر دیا گیا تھا کہ پاکستان شریعت کونسل کا کوئی بھی رکن یا عہدیدار کسی بھی سیاسی فورم سے انتخابات میں حصہ لے سکتا ہے اور کسی بھی سیاسی جماعت کی رکنیت اختیار کر سکتا بشرطیکہ وہ وہاں بھی پاکستان شریعت کونسل کے مذکورہ بالا تین مقاصد کے لیے محنت کرتا رہے۔

موجودہ عالمی اور ملکی حالات کے پیش نظر پاکستان کی اسلامی حیثیت اور ملک کے دینی حلقوں اور مراکز کے مستقبل کے حوالہ سے ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۲ء کے انتخابات انتہائی اہمیت اختیار کر گئے ہیں اس لیے اقتدار کی کشمکش سے قطع نظر ملی، قومی و دینی تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستان شریعت کونسل کے امیر حضرت مولانا فداء الرحمٰن درخواستی اور سیکرٹری جنرل راقم الحروف ابوعمار زاھد الراشدی کی طرف سے حسب ذیل اپیل جاری کی جا رہی ہے ملک بھر کے احباب سے گزارش ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ حضرات تک پہنچانے کی کوشش کریں اور خواص وعوام کو اس موقع پر ان کی دینی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلانے کے لیے بھرپور کردار ادا کریں۔

مکرمی!

السلام وعلیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

گزارش ہے کہ وطن عزیز اسلامی جمہوریہ پاکستان اپنے قیام کے بعد سے ہی عالمی اور ملکی سطح پر اسلام دشمن عناصر کی مکروہ سازشوں کی زد میں رہا ہے اور اس بات کی مسلسل کوشش کی جارہی ہے کہ (۱) پاکستان خودمختاری اور آزادی کے ساتھ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو (۲) پاکستان کی اسلامی نظریاتی حیثیت مستحکم نہ ہونے پائے (۳) پاکستان میں جاگیردارانہ اور نوآبادیاتی استحصالی نظام کے خاتمہ اوراس کی جگہ اسلام کے عادلانہ نظام کے نفاذ کی جدوجہد میں کوئی عملی پیش رفت نہ ہو سکے۔(۴) پاکستان معاشی اورعسکری طور پر خودمختار اور باوقار حیثیت نہ حاصل کرسکے ۔ (۵) پاکستان کی دینی قوتوں میں خلفشار کی فضا قائم رہے اور وہ پاکستانی قوم کی قیادت کے لیے اجتماعی کردار ادا کرنے کے قابل نہ رہیں۔(۶) پاکستان میں فحاشی اور عریانی پر مشتمل مغربی اور ہندو کلچر کے اثرات کو وسیع سے وسیع تر کردیا جائے۔(۷) پاکستان میں دینی ادارے مراکز اور شخصیات کی کردار کشی کر کے عوام کو ان سے دور رکھا جائے ۔(۸) ایک اسلامی نظریاتی ریاست کے طور پر دنیا کے نقشے پر نمودار ہونے والے پاکستان سے عالم اسلام بالخصوص ملت اسلامی کے دینی حلقوں نے جو توقعات وابستہ کررکھی ہیں ان کی تکمیل کی کوئی عملی صورت پیدا نہ ہو۔(۹) نئی نسل کو ہر قیمت پر دین اور دینی اثرات سے دور رکھا جائے اور (۱۰) بالآخر پاکستان کو ترکی کی طرح ایک سیکولر ریاست اور معاشرہ کا درجہ دے دیا جائے۔

گزشتہ سال ۱۱ستمبر کے سانحات کی آڑ میں افغانستان پر امریکی اتحاد کے حملے اور دنیا بھر کی اسلامی تحریکات اور جہادی قوتوں کے خلاف منفی پروپیگنڈے اور اقدامات کے ساتھ اس مہم کو مزید تیز کردیا گیا ہے اور عالمی استعمار اپنے مقامی معاونین کے تعاون سے پاکستان کو سیکولر ملک کی حیثیت دینے کے ایجنڈے پر تیز رفتاری کے ساتھ اپنے کام کو آگے بڑھا رہا ہے۔

ان حالات میں ۱۰/اکتوبر ۲۰۰۲ء کو ہونے والے عام انتخابات انتہائی اہم حیثیت اختیار کرگئے ہیں اور (۱) پاکستان کی اسلامی حیثیت کے تحفظ (۲) وطن عزیز کی خودمختاری اور قومی آزادی کی بحالی

اور دینی مراکز کے حوالہ سے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ ملک کا ہر ووٹر اپنی ترجیحات کا از سر نو جائزہ لے اور برادری ازم، دھڑے بندی اور سیاسی وابستگیوں سے بالاتر ہوکر اس الیکشن میں ایسے افراد کو سامنے لانے کے لیے کردار ادا کرے جو دینی سوچ، نظریاتی کردار اور ملی حمیت وغیرت کے حامل ہوں کیونکہ ایسے حضرات ہی موجود بحران سے ملک وقوم کو باوقار طور پر نکال کر خود مختاری، آزادی اور اسلامی تشخص کی شاہراہ پر گامزن کر سکتے ہیں اور اگر خدانخواستہ اس موقع پر بھی دینی تقاضوں اور ملی ضروریات کو قبیلہ، برادری، لوکل دھڑے بندی اور سیاسی وابستگیوں پر قربان کر دیا گیا تو پاکستان کے گرد استعماری نظام کا شکنجہ سخت تر ہوتا چلا جائے گا اور ملک وقوم کی رہی سہی آزادی بھی ختم ہوکر رہ جائے گی۔

یہ انتہائی خوشی کی بات ہے کہ ملک کی دینی جماعتیں ''متحدہ مجلس عمل'' کے نام سے متحد ہوکر ان انتخابات میں قوم کے سامنے آ گئی ہیں اور تمام دینی مکاتب فکر نے اجتماعی دینی قیادت کی عملی شکل ملت کے سامنے پیش کر دی ہے جس سے یہ توقع پیدا ہوگئی ہے کہ اگر اس قیادت کو پاکستان کے عوام نے ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں آگے آنے کا موقع فراہم کیا تو وطن عزیز کو عالمی استعمار کے مفادات اور سازشوں کی دلدل سے نکالنے، نوآبادیاتی استحصالی نظام کے خاتمہ، اسلامی نظام کے نفاذ اور قومی خود مختاری کی بحالی کی کوئی صورت ضرور نکل آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اس لیے تمام مکاتب فکر کے علماء کرام، دینی کارکنوں اور غیور مسلمانوں سے اپیل ہے کہ وہ ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۲ء کے الیکشن کو ''ٹیسٹ کیس'' سمجھتے ہوئے اس میں ''متحدہ مجلس عمل'' کے امیدواروں کی کامیابی کے لیے متحرک ہو جائیں اور صرف ووٹ دینے پر اکتفا کرنے کے بجائے اپنے اپنے حلقہ اثر میں ''متحدہ مجلس عمل'' کے امیدواروں کے لیے کام کریں اور انہیں کامیاب بنانے کے لیے مقامی حالات کی روشنی میں جو عملی کردار بھی ادا کر سکتے ہوں اس سے گریز نہ کریں۔ ''متحدہ مجلس عمل'' سے ہٹ کر چند دیگر رہنماؤں کے حوالے سے بھی گزارش کرنا ضروری ہے جن میں راولپنڈی سے محترم راجہ ظفر الحق، کوہاٹ سے حاجی جاوید ابراہیم پراچہ اور جھنگ سے مولانا اعظم طارق بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ یہ حضرات اگرچہ ''متحدہ مجلس عمل'' کی طرف سے امیدوار نہیں ہیں لیکن اپنے نظریاتی کردار اور خدمات

کے تسلسل میں بھرپور اعتماد کے حامل ہیں اور یہ جس فورم سے بھی منتخب ہو کر اسمبلی میں پہنچے ان شاءاللہ تعالیٰ حق کی آواز بلند کریں گے اور حق کا ہی ساتھ دیں گے۔ اس لیے ملک بھر میں ''متحدہ مجلس عمل'' کے امیدواروں کو کامیاب بنانے اور ان کے لیے بھرپور محنت کرنے کی اپیل کے ساتھ ساتھ ان تین حضرات کے حلقوں سے تعلق رکھنے والے علماء کرام اور دینی کارکنوں سے بطور خاص گزارش ہے کہ وہ ان کی کامیابی کے لیے ہر ممکن محنت کریں اور ان سے بھرپور تعاون فرمائیں۔

(روزنامہ اسلام مظفرآباد)

متحدہ مجلس عمل کی شاندار کامیابی

عام انتخابات کے نتائج نے ایک دنیا کو حیران وششدر کردیا ہے اوران کے بارے میں سب کے سب اندازے غلط ثابت ہوئے ہیں، خود میرا اندازہ یہ تھا بلکہ برطانیہ آمد کے بعد اکثر دوست مجھ سے پوچھتے رہے تو میں ان سے یہی کہتا تھا کہ متحدہ مجلس عمل بیس کے لگ بھگ قومی اسمبلی میں سیٹیں حاصل کر پائے گی اور اگر اسمبلی میں مجلس عمل کی قیادت اس طرح اکٹھی رہی جس طرح اس الیکشن کمپین میں اس نے یک جہتی کا اظہار کیا ہے، اور اگلے انتخابات تک یہ اتحاد قائم رہا تو مجلس عمل کے ملک گیر سطح پر الیکشن جیتنے کی توقع بھی کی جاسکتی ہے۔ اگلے انتخابات کے بارے میں تو میرا اندازہ اب بھی وہی ہے کہ اگر پارلیمنٹ کے اندر مجلس عمل نے ٹیم ورک کا ماحول پیدا کرلیا، اقتدار میں شامل ہونے کی بجائے اپوزیشن میں بیٹھ کر عوامی جذبات کی بے لاگ ترجمانی کی، عوام کے حقیقی مسائل اور قومی خودمختاری کی بحالی کو اپنے ایجنڈے میں اولیت دی، اور پارلیمنٹ سے باہر بھی مجلس عمل میں شامل جماعتوں نے عوامی سطح پر اپنے اتحاد واشتراک کا مظاہرہ مسلسل جاری رکھا تو الجزائر کے اسلامک سالویشن فرنٹ کی طرح پاکستان میں دینی جماعتوں کی متحدہ مجلس عمل بھی اگلے عام انتخابات میں فیصلہ کن اکثریت حاصل کرسکتی ہے، لیکن حالیہ انتخابات کے نتائج خود میرے لیے بھی خوشگوار حیرت کا باعث بنے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ میں گوجرانوالہ شہر اور کراچی کے ایک آدھ پروگرام کے سوا اس انتخابی مہم کو خود اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکا، اور اپنے سابقہ تجربہ کے ساتھ ساتھ اخبارات کی خبریں اور تجزیے ہی میری معلومات کا بڑا ذریعہ رہی ہیں، وجہ خواہ کچھ بھی ہو، بہرحال

مجھے انتخابات میں ان نتائج کی توقع نہ تھی، اور دس اکتوبر کی شام کو جوں جوں انتخابی نتائج کی تفصیلات معلوم ہوتی گئیں میرے حیرت اور تعجب میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا یہ الگ بات ہے کہ بہت سے لوگوں کے تعجب اور حیرت میں افسوس، حسرت اور غصہ کا عنصر شامل تھا لیکن دنیا بھر کے کارکنوں کی طرح میرے تعجب اور حیرت میں خوشی اور تشکر کے جذبات موجزن تھے۔

میں دس اکتوبر کی شام کراؤلی (برطانیہ) میں مولانا قاری عبدالرشید رحمانی کے ہاں تھا جو استاذ الاساتذہ حضرت مولانا رسول خان ہزارویؒ کے پوتے ہیں اور کراولی کی جامع مسجد میں خطیب ہیں۔ جمعیت علما برطانیہ کے قاری محمد ہاشم بھی وہیں تھے جو اپنے موبائل فون پر مسلسل معلومات حاصل کر رہے تھے اور مجھے آگاہ کرتے جاتے تھے، ان کی خوشی قابل دید تھی، اور میری خوشی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا، حتیٰ کہ رات گئے برمنگھم سے مولانا قاری تصورالحق نے مجھے بطور خاص فون کر کے اطلاع دی کہ میرے شہر گوجرانوالہ سے متحدہ مجلس عمل کے امیدوار مولانا قاضی حمیداللہ خان نے بھی قومی اسمبلی کی سیٹ جیت لی ہے تو خاشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

متحدہ مجلس عمل کی یہ شاندار کامیابی کہ اس نے قومی اسمبلی میں تیسری بڑی سیاسی قوت کی پوزیشن حاصل کر لی ہے عام طور پر اس کے دو بڑے سبب بیان کیے جا رہے ہیں ایک یہ افغانستان پر امریکہ کے وحشیانہ حملہ اور طالبان کی مظلوم و معصوم حکومت کی تباہی پر پاکستان کے عوام بالخصوص صوبہ سرحد و بلوچستان کے غیور مسلمانوں کو اپنے غصے کے اظہار کا کوئی موقع نہیں مل رہا تھا، اس لیے انہوں نے اس الیکشن میں طالبان کی سپورٹ جماعت کو ووٹ دے کر اس غصے کا عملاً اظہار کیا ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار مختلف مکاتب فکر کی دینی جماعتوں نے کسی اور سیاسی اتحاد میں شامل ہونے کے بجائے خود اپنا سیاسی اتحاد قائم کر کے جداگانہ تشخص کے ساتھ انتخابات میں حصہ لیا ہے جس کی پاکستان کی عوام کو خوشی ہوئی ہے، اور انہوں نے دینی جماعتوں کو ووٹ دے کر اپنی اس خوشی کا برملا اظہار کیا ہے۔

یہ دونوں باتیں درست ہیں متحدہ مجلس عمل کے حق میں اتنی بڑی تعداد میں ووٹ ڈال کر پاکستان کے عوام نے صرف غصہ کا اظہار نہیں کیا بلکہ امریکہ اور اسکے حمایتیوں کو یہ پیغام بھی دیا ہے کہ

ڈیزی کٹرز کی بارش، اقوام متحدہ کی قراردادوں، عالمی برادری کے یک طرفہ موقف اور ورلڈ میڈیا کے مسلسل منفی پروپیگنڈے کے باوجود طالبان اور عرب مجاہدین کے بارے میں ان کی رائے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، وہ اب روسی استعمار کے خلاف افغان عوام کے جہاد آزادی کے منطقی نتائج کی عملی شکل طالبان کی ہی صورت میں دیکھنے کے خواہشمند ہیں، اور خلیج عرب میں امریکی فوجوں کی موجودگی اور اس کی طرف سے اسرائیل کی پشت پناہی کو ناجائز اور سراسر انصافی اور ظلم تصور کرتے ہوئے اسکے خلاف اسامہ بن لادن اور ان کے رفقا کی جدوجہد کو جائز اور درست تصور کرتے ہیں۔

خدا جانے مغرب کے ارباب حل وعقد کو یہ غلط فہمیاں کہاں سے ہوگئی ہے کہ جبر وتشدد اور یک طرفہ پروپیگنڈے کے زور سے قوموں کی رائے تبدیل کیا جاسکتی ہے، اوران کے جذبات واحساسات کو دفن کیا جاسکتا ہے، پاکستان کے غیسور شہریوں اور خاص طور پر صوبہ سرحد اور بلوچستان کے عوام نے ایک بار پھر اس حقیقت کا اظہار کر دیا ہے کہ رائے کی تبدیلی کا تعلق طاقت، جبر وتشدد سے نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف اور صرف دلیل اور منطق کے ذریعے ہی تبدیل ہوتی ہے، عباسی دور خلافت میں قرآن کریم کے مخلوق ہونے کے غلط عقیدہ کو منوانے کے لیے جب حکومت کی طرف جبر سے کام لیا گیا، اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ پر ان سے یہ منوانے کے لیے کوڑے برسائے گئے کہ وہ اس بات کا اقرار کر دیں کہ قرآن کریم اللہ تعالی کی صفت کلام کا مظہر نہیں بلکہ مخلوق ہے تو امام احمد بن حنبل نے برستے کوڑوں میں یہ جواب دیا کہ کوئی دلیل پیش کرو تو سننے اور ماننے کو تیار ہوں لیکن کوڑوں کی ضرب اور جسم کے لہولہان ہونے کی وجہ سے اپنا عقیدہ اور رائے تبدیل نہیں کر سکتا۔

میرے خیال میں متحدہ مجلس عمل کو ووٹ دینے والے پاکستانی عوام نے بھی اپنے عمل کے ساتھ حضرت امام احمد بن حنبل کے اسی موقف کو دہرایا ہے، کہ اقوام متحدہ کی یک طرفہ قراردادوں، عالمی میڈیا کا معاندانہ پروپیگنڈا طاقت کے استعمال کی دھمکی کے ذریعہ قائم ہونے والی عالمی اتحاد کے فیصلوں اور ڈیزی کٹرز کی بارش سے ہزاروں انسانوں کے جسموں کے پرخچے اڑا کر کسی کو دہشت گرا اور انتہا پسند ثابت نہیں کیا جاسکتا تھا، اور نہ ہی باضمیر لوگ عقیدہ اور رائے کے بارے میں ان ''دلیلوں'' کو ماننے کے لیے تیار ہیں۔

اس لیے متحدہ مجلس عمل کے قائدین مولانا فضل الرحمان ،مولانا شاہ احمد نورانی ،قاضی حسین احمد،مولانا سمیع الحق، پروفیسر ساجد میر،اورعلامہ ساجد نقوی کواس شاندار کامیابی پرمبارک باد دیتے ہوئے میں متحدہ مجلس عمل کو ووٹ دینے والے غیور پاکستانیوں کو''سلام عقیدت'' پیش کرتا ہوں، کہ انہوں نے طاقت اور جبر کی دلیل کوایک بار پھرمسترد کر دیا ہےاور دنیاپر واضح کر دیاہیکہ پاکستان کے عوام جبر وتشدداور دباؤ کے حصار میں بھی حق بات کہنےاورحق کی حمایت میں رائے دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

باقی رہی یہ بات یہ کہ دینی جماعتوں کےمتحد ہونے پراوراپنا جداگانہ سیاسی تشخص قائم کرنے پر پاکستان کےعوام کوخوشی ہوئی تواس میں بھی شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے،دینی جماعتوں نے موجودہ اتحاد قائم کرنے کے بعد پہلی کامیابی ووٹرز فارم سےعقیدہ ختم نبوت کا حلف نامہ حذف کرنے کے خلاف اپنے احتجاج کی پذیرائی کی صورت میں حاصل تھی ،دوسری کامیابی مدارس دینیہ کے بارے میں حکومتی آرڈیننس کی پسپائی کی شکل میں ان کے حصہ میں آئی اوراب تیسری کامیابی بھی انہوں نے دیکھ لی ہے جوصرف کامیابی نہیں بلکہ آئندہ کئی کامیابیوں کی کلید بھی بن سکتی ہے،بشرطیکہ متحدہ مجلس عمل اپنی صفوں میں اتحاد قائم رکھے، پارلیمنٹ کےاندراور باہرٹیم ورک کاماحول پیدا کرے ،اقتدار کی دوڑ میں شریک ہونے کے بجائےعوام جذبات کی ترجمانی اورعوام کےحقیقی مسائل کی نشاندھی کے کردارکوترجیح دےاوراپنی پالیسیاں اورترجیحات طے کرتے ہوئے ان مجاہدین اورشہداء کوبھی یادرکھےجن کے''مقدس خون'' کی برکت سےمتحدہ مجلس عمل کویہ مقام حاصل ہوا ہے۔

(روزنامہ اوصاف،۱۶/اکتوبر۲۰۰۲)

متحدہ مجلس عمل سے ہماری توقعات

[ماہنامہ 'یوتھ کانٹیکٹ' گوجرانوالہ کے دسمبر ۲۰۰۲ء کے شمارے
میں شائع ہونے والے ایک انٹرویو سے اقتباس]

س: پاکستان کے حالیہ عام انتخابات میں متحدہ مجلس عمل کی کامیابی کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

ج: متحدہ مجلس عمل کو میرے خیال میں دو وجہ سے عوام میں پذیرائی ملی ایک ان کے اتحاد کی وجہ سے کہ پاکستان کی نصف صدی کی تاریخ گواہ ہے کہ دینی حلقوں اور مذہبی مکاتب فکر نے جب بھی متحد ہو کر کسی ملی کاز کے لیے قوم کو آواز دی ہے قوم نے انہیں کبھی مایوس نہیں کیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ گزشتہ سال امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کو ختم کرنے اور اپنی کٹھ پتلی حکومت مسلط کرنے کے لیے جو قیامت ڈھائی ہے اور افغانستانی عوام کو جس شرم ناک طریقے سے درندگی اور دہشت گردی کا نشانہ بنایا ہے پاکستان بالخصوص صوبہ سرحد اور بلوچستان کے عوام نے الیکشن میں اس کے خلاف اپنی نفرت اور غصے کا بھرپور اظہار کر دیا ہے اور ان عناصر کے اس منفی پراپیگنڈے کا عملی جواب دیا۔ جو اب تک یہ کہتے آ رہے تھے کہ پاکستان میں دینی جماعتوں کو عوام کی حمایت حاصل نہیں ہوتی میرے خیال میں اس سے امریکہ اور اس کے سارے حواریوں کو سبق حاصل کرنا چاہئے اور نوشتہ دیوار پڑھتے ہوئے اپنی پالیسیوں اور طرز عمل پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔

س: متحدہ مجلس عمل سے آپ قومی سیاست کے حوالے سے کیا توقعات رکھتے ہیں؟

ج: میرے خیال میں متحدہ مجلس عمل کو مرکز میں اقتدار کی کشمکش میں شریک نہیں ہونا چاہئے تھا اور ۱۹۷۳ء کے آئین کے دستور کی بنیادوں کے تحفظ پر اپنی ساری توجہ مرکوز رکھنی چاہئے تھی اس وقت ملک میں حقیقی جمہوریت اور ۱۹۷۳ء کے دستور کی بنیادوں کے تحفظ کے لیے سب سے نمایاں اور مضبوط آواز متحدہ مجلس عمل ہے اس آواز کے ساتھ اقتدار اور وزارتوں کی خواہش کی آمیزش نہ ہوتی تو زیادہ بہتر تھا بہرحال پھر بھی غنیمت ہے کہ متحدہ مجلس عمل نے اصولوں پر کسی قسم کی بازی نہ کرنے کا اعلان کیا ہے میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ متحدہ مجلس عمل کو اس اصولی موقف پر استقامت اور اس میں سرخروئی سے نوازیں۔

۱۔ وہ مرکز میں اقتدار کے کھیل سے کنارہ کش رہے اور اپوزیشن میں بیٹھ کر عوام کے جذبات کی ترجمانی کرے۔

۲۔ صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت عوامی مسائل کے حل کے ساتھ اسلامی طرز حکومت کا ایسا نمونہ عملاً پیش کرے جو دوسرے صوبوں کے لیے بھی مشعل راہ ہو اور اگلے الیکشن میں دوسرے صوبوں کے عوام بھی متحدہ مجلس عمل کو موقع دینے پر مجبور ہو جائیں۔

۳۔ متحدہ مجلس عمل کو یہ ووٹ افغانستان کے مظلوم عوام کے خون کی برکت سے ملے ہیں اور عالمی استعمار کی ڈٹ کر مخالفت کرنے کی وجہ سے ملے ہیں اس حوالے سے مجلس عمل کے موقف اور عملی کردار میں کسی قسم کی کوئی لچک نہیں ہونی چاہئے۔

۴۔ دینی مکاتب فکر کے اتحاد کو ہر قیمت پر قائم رکھا جائے باہمی ایثار و اعتماد کے ساتھ اس کے دائرہ کار میں وسعت پیدا کی جائے اور اس بات سے ہر وقت چوکنا رہا جائے کہ مخالفین کی طرف سے سب سے زیادہ کوشش یہی ہوگی کہ اس وحدت اور باہمی اعتماد میں کسی نہ کسی طرح دراڑیں ڈال دی جائیں۔

۵۔ صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت ایک علمی کمیشن قائم کرے جو اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کا گہری نظر سے مطالعہ کر کے ان میں سے صوبائی اختیارات سے تعلق رکھنے والی

سفارشات کو الگ کرے اور ان کے عملی نفاذ کے لیے طریق کار تجویز کرے۔

۶۔ متحدہ مجلس عمل کے وزراء پروٹوکول اور پرسٹیج کے چکروں سے خود کو الگ تھلگ رکھتے ہوئے سادگی، قناعت، اور کفایت شعاری کا نمونہ پیش کریں اور اپنے عمل کے ساتھ واضح کریں کہ ایک اسلامی حکومت کے وزراء کس طرح کام کرتے ہیں۔

عالمی اسلامی تحریکات کی مجلس عمل سے وابستہ توقعات

پاکستان میں حالیہ انتخابات کے نتائج پر دنیا بھر میں جہاں حیرت کا اظہار کیا جارہا ہے وہاں مختلف ممالک کے دینی حلقوں اور اسلامی تحریکات میں توقعات اور امیدوں کی ایک نئی لہر بھی ابھری ہے، گزشتہ سال افغانستان پر امریکہ کے حملوں اور پاکستان میں طالبان کی حمایت کرنے والی دینی شخصیات اور کارکنوں کی وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کے ساتھ ساتھ جہادی تحریکات کے خلاف کریک ڈاؤن سے مایوسی اور اضطراب کی جو صورت حال پیدا ہوگئی تھی اس پس منظر میں متحدہ مجلس عمل کی انتخابی کامیابی سے دنیا بھر کی دینی تحریکات کو حوصلہ ملا ہے، مجھے اس سلسلہ میں لندن میں جن شخصیات سے ملاقات وگفتگو کا موقع ملا ان کے تاثرات پیش خدمت ہیں۔

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کا شمار بھارت کے ممتاز علمی شخصیات میں ہوتا ہے، وہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی قدس اللہ سرہ العزیز کے فرزند ہیں، ایک مدت سے ماہنامہ ’’الفرقان‘‘ لکھنو کے ایڈیٹر ہیں، صاحب فکر ودانش ہیں کافی عرصہ سے لندن میں مقیم ہیں، ان سے ہر سال لندن میں حاضری پر ملاقات کا موقع ملتا ہے، اس دفع ملاقات ہوئی تو دریافت کیا کہ انہوں نے ’’الفرقان‘‘ میں جو تفصیلی مضمون لکھا ہے وہ میری نظر سے گزرا ہے یا نہیں، یہ مضمون ’’الفرقان‘‘ کے اداریے کے طور پر دو قسطوں میں چند ماہ قبل شائع ہوا تھا، میں نے اس کے بارے میں سن رکھا تھا لیکن دیکھ نہیں پایا تھا، اس میں انہوں نے طالبان کی پالیسیوں اور سیاسی وفکری طرز عمل پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور اس حسرت کا اظہار کیا ہے کہ افغانستان میں طالبان کی صورت میں ایک مثالی اسلامی ریاست

وحکومت کا جو خواب دنیا بھر کے مسلمانوں نے دیکھا تھا وہ طالبان قیادت کے خلوص و دیانت اور سادگی و ایثار کے باوجود اس کی بعض مسائل میں غلط حکمت عملی کے باعث بکھر کر رہ گیا ہے، میں نے ان کے اس ارشاد کے بعد وہ مضمون دیکھا، مولانا سنبھلی کا خیال تھا کہ میں ان کے مضمون پر سخت ردعمل کا اظہار کروں گا مگر میں نے عرض کیا کہ مجھے ان کے موقف سے نہ صرف یہ کہ اصولی طور پر اتفاق ہے بلکہ میں ان کے مضمون کو ماہنامہ ''الشریعۃ'' گوجرانوالہ میں شائع کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہوں، مجھے ان لوگوں سے اتفاق نہیں ہے جو طالبان قیادت کو ''معصومیت'' کے مقام پر فائز کر کے ان کی حکمت عملی اور پالیسیوں سے اختلاف کو ''گناہ'' قرار دیئے ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں اہل علم ودانش کو طالبان حکومت کے پانچ سالہ دور کا پوری تفصیل اور گہرائی کے ساتھ جائزہ لینا چاہئے اور خالصتاً علمی اور فکری بنیادوں پر جہاں انہیں کوئی جھول اور غلطی محسوس ہو اس کی صاف طور پر نشاندہی کرنی چاہئے کیونکہ طالبان اگر افغانستان کے معاملات میں دوبارہ آگے آنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ان کے ذہن میں مستقبل کا کوئی نقشہ ہے تو اصحاب علم ودانش کا یہ بحث ومباحثہ ان کے پیش نظر ہونا چاہئے اور اسے سامنے رکھ کر انہیں اپنی نئی حکمت عملی اور پالیسیاں ترتیب دینی چاہئیں۔

البتہ مولانا سنبھلی سے میں نے یہ گزارش کی کہ ان کی اس بات سے مجھے اتفاق نہیں ہے کہ ''خواب بکھر گیا ہے'' اور معاملہ ختم ہو گیا ہے کیونکہ ابھی بہت سے مراحل باقی ہیں، ابھی عشق کے اور بھی کئی امتحان انتظار میں ہیں اور ستاروں سے آگے جہانوں کا سلسلہ ابھی بہت وسیع ہے میرے اندازے کے مطابق ابھی طالبان نے ایک کروٹ لینی ہے اور جہاد افغانستان میں اسلام کی سربلندی کے جذبہ کے ساتھ حصہ لینے والے مجاہدین کی نئی صف بندی ہونی ہے اس لیے موجودہ صورتحال کو حتمی تصور نہ کیا جائے اور اسے محمود غزنویؒ کے سومنات پر کئے جانے والے ان سولہ حملوں میں سمجھ لیا جائے جنہیں بعض لوگ ناکام حملے قرار دیتے ہیں لیکن میں انہیں سترھویں اور کامیاب حملے کی تمہید سمجھتا ہوں۔

متحدہ مجلس عمل کی انتخابی کامیابی پر مولانا سنبھلی بہت خوش ہیں البتہ ان کی رائے یہ ہے کہ متحدہ

مجلس عمل کو اپنی تمام تر توجہ صوبہ سرحد کی حکومت پر مبذول رکھنی چاہئے اور وہاں حکومت کا ایسا نمونہ پیش کرنا چاہیے جو ملک کے دوسرے حصوں کے عوام کے لیے بھی کشش کا باعث بن سکے اور آئندہ انتخابات میں متحدہ مجلس عمل کی ملک گیر کامیابی کا ذریعہ ثابت ہو۔

ڈاکٹر محمد بن عبداللہ المسعری سعودی عرب کے ان دانشوروں میں سے ہیں جو امریکی فوجوں کی خلیج میں آمد کے موقع پر شاہ فہد کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کرنے کے جرم میں زیر عتاب ہیں، وہ ریاض یونیورسٹی کے پروفیسر تھے، اس عرضداشت پر دستخط کرنے کے جرم میں گرفتار ہوئے ،کسی طرح جیل سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے اور یمن کے راستے لندن پہنچ کر سیاسی پناہ لیے ہوئے ہیں، وہ اپنے جذبات کے اظہار کے لیے خود میری تلاش میں تھے ایک روز میری قیام گاہ پر تشریف لائے اور مختلف مسائل پر ان سے تفصیلی بات چیت ہوئی ،انہوں نے متحدہ مجلس عمل کی کامیابی کو اسلامی قوتوں کی ایک اہم پیش رفت قرار دیا اور کہا کہ متحدہ مجلس عمل کو یہ ووٹ افغانستان میں امریکی مظالم کے ردعمل میں ملے ہیں۔اور پاکستان کے غیور مسلمانوں نے اپنے جذبات کا اچھے انداز میں اظہار کیا ہے،اب اس ووٹ بینک کو سنبھالنے اور اس میں اضافے کے لیے ٹھوس حکمت عملی کی ضرورت ہے اور متحدہ مجلس عمل کو اپنے کام کا دائرہ پھیلانے کے بجائے سرحد اور بلوچستان کو سرگرمیوں کا مرکز بنانا چاہیے، اگر صوبہ سرحد کی حکومت کی صورت میں ملک کے عوام کو یہ نظر آ گیا کہ یہ حکومت سابقہ حکومتوں سے مختلف ہے اور حکمرانی کی بجائے عوام کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہے تو پنجاب اور سندھ کے لوگ بھی آئندہ سوچنے پر مجبور ہوں گے لیکن اگر دوسرے صوبوں کی حکومتوں کی طرح صوبہ سرحد کی حکومت بھی روایتی ڈگر پر چلتی رہی اور لوگوں کو کوئی نمایاں عملی فرق دکھائی نہ دیا تو متحدہ مجلس عمل اپنے موجودہ ووٹ بینک کی حفاظت بھی نہیں کر سکے گی ڈاکٹر مسعود نے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی اور اسٹیبلشمنٹ اس کے لیے حربہ اختیار کرے گی جس میں فنڈ کی فراہمی میں رکاوٹیں بھی شامل ہیں اس پر قابو پانے کے لیے عوام کو ساتھ ملانا ہوگا اور امداد باہمی کو فروغ دے کر رفاہی اور سماجی کاموں کا دائرہ بڑھانا ہوگا۔انہوں نے مثال دی کہ الجزائر میں اسلامک سلویشن

فرنٹ نے پہلے مرحلہ میں بلدیاتی انتخابات میں کامیابی حاصل کی تھی اورلوکل حکومتیں بنائی تھیں،جنہیں ناکام بنانے کے لیے مرکزی حکومت نے ضروری فنڈز روک لئے مگر اسلامک سلویشن فرنٹ نے اس کی پرواہ کئے بغیر عام لوگوں سے رضا کارانہ طور پر خدمات سرانجام دینے کی اپیل کی اورفرنٹ کی قیادت خود بھی خدمت گزاروں میں شامل ہوگئی،مقامی حکومتوں کے ذمہ دار حضرات عام لوگوں کے ساتھ مل کر گلیوں کی صفائی کرتے اور مختلف شعبوں میں رضا کارانہ خدمات سرانجام دیتے جس کی

(روزنامہ اوصاف،۱۶رنومبر۲۰۰۲)

مولانا مفتی محمود اور اکرم درانی

اکرم درانی صاحب سے ممکن ہے کسی موقع پر ملاقات ہوئی ہو مگر مجھے یاد نہیں ہے اور صوبہ سرحد کے وزارت اعلیٰ کے لیے ان کے انتخاب سے قبل اخبارات میں کبھی کبھار ان کا نام پڑھنے کے علاوہ ان کا کوئی تعارف بھی ذہن میں نہیں تھا اس لیے مجھے متحدہ مجلس عمل کی طرف سے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کے منصب کے لیے ان کے چناؤ پر تعجب ہوا کہ اس انتہائی نازک اور حساس موقع پر اس انتہائی اہم منصب کے لیے کسی معروف اور بھاری بھرکم شخصیت کی بجائے ان کا انتخاب آخر کس بنیاد پر کیا گیا ہے؟ رمضان المبارک سے قبل میں برطانیہ میں تھا اور ماہ مبارک کے دوسرے ہفتہ کے دوران وطن واپسی کے بعد سے گوجرانوالہ میں رمضان المبارک کے حوالہ سے مقامی مصروفیات کے حصار میں ہوں، جس کی وجہ سے متحدہ مجلس عمل کے قائدین میں سے کسی سے ملاقات بھی ابھی تک نہیں ہو پائی، ورنہ ملاقات کی صورت میں پہلا سوال ذہن میں یہی تھا کہ اکرم درانی کون ہیں؟ اور اتنے اہم اور نازک منصب کے لیے ان کا انتخاب کیسے کر لیا گیا؟ میرا خیال تھا کہ اگر آئینی رکاوٹ نہ ہو تو صوبہ سرحد کا وزیر اعلیٰ مولانا فضل الرحمٰن، مولانا سمیع الحق یا قاضی حسین احمد میں سے کسی کو ہونا چاہیے کیونکہ افغانستان کے پڑوس میں متحدہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت کو اپنے منشور پر عملدرآمد بلکہ کاروبار حکومت چلانے میں بھی جن رکاوٹوں اور مشکلات کا سامنا ہو سکتا ہے اور جن چیلنجوں کے امکانات دن بدن واضح ہوتے جا رہے ہیں ان سے نمٹنے کے لیے صرف صوبائی اسمبلی میں اکثریت اور اچھے وزراء کی ٹیم کافی نہیں ہوگی، بلکہ حکومتی ٹیم کے کپتان کے طور پر کسی بھاری بھرکم

شخصیت کی بھی ضرورت ہوگی چنانچہ صوبہ سرحد کی وزارت اعلیٰ کے لیے متحدہ مجلس عمل کی طرف سے جناب اکرم درانی کا نام سامنے آنے پر مجھے تشویش ہوئی اور پہلا تاثر ذہن میں یہ ابھرا کہ شاید ایم ایم اے کی قیادت کو صوبہ سرحد کی حکومت کا کاروبار چلانے میں متوقع مشکلات کا پوری طرح احساس نہیں ہے یا وہ اس معاملہ میں اس قدر سنجیدہ نہیں ہے جتنا کہ اسے ہونا چاہیے۔ بھلا ہو برادرم حامد میر صاحب کا کہ انہوں نے اپنے کالم ''قلم کمان'' میں یہ بتا کر میری تشویش ایک حد تک کم کر دی کہ اکرم درانی کا خاندانی تعلق فقیر ایپیؒ کے اس حریت پسند اور مجاہد گروہ سے ہے جس نے ایک عرصہ تک اس خطہ میں برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف جہاد آزادی کا محاذ گرم رکھا اور جس کا نام سامنے آتے ہی حریت اور جہاد کے حقیقی مفہوم سے آشنا مسلمانوں کی گردنیں عقیدت ومحبت سے خم ہو جاتی ہیں۔

فقیر ایپیؒ تحریک آزادی کے نامور مجاہدین میں سے تھے اور حامد میر کے بیان کے مطابق اکرم درانی فقیر ایپیؒ کے دست راست حاجی گل نوازؒ کے پوتے ہیں، جن کا گھر انگریزوں نے اس جرم میں بموں سے اڑا دیا تھا اور ان کی جائیداد ضبط کر کے کوڑیوں کے مول فروخت کر دی تھی کہ وہ اپنے ملک اور قوم کی آزادی کے لیے ہتھیار اٹھائے ہوئے تھے اور غیر ملکی قابضین سے وفاداری کی اسناد حاصل کرنے کی بجائے ان سے اپنے وطن سے نکل جانے کا مطالبہ کر رہے تھے حاجی گل نوازؒ کا یہ پوتا اگر اپنے عظیم دادا کے ساتھ رشتے کے علاوہ فکری وابستگی بھی رکھتا ہے اور یقیناً رکھتا ہوگا تو میں متحدہ مجلس عمل کو اس احسن انتخاب پر داد دیتا ہوں اور جناب اکرم درانی کو صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے اپنی سیاسی زندگی کے ایک نئے دور کے آغاز پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اکرم درانی اور ان کا کابینہ نے حلف برداری کے مرحلہ سے گزر کر صوبہ سرحد کا کاروبار حکومت سنبھال لیا ہے اور اب انہیں خود کو اس اعتماد کا اہل ثابت کرنے کے لیے عملی پیش رفت کرنی ہے جس کا اظہار صوبہ سرحد کے عوام نے ۱۰ اکتوبر کے انتخاب میں کھلے بندوں کیا ہے اور انہیں ان توقعات پر پورا اترنے کے لیے بھی خود کو ہر وقت چوکس رکھنا ہے جو صوبہ سرحد سے باہر نہ صرف پاکستان کے دیندار عوام بلکہ دنیا بھر کی اسلامی تحریکات اور دینی کارکنوں نے صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس کی حکومت سے وابستہ کر لی ہیں۔ میں اس سے قبل ایک مضمون میں اس بات کا تذکرہ کر چکا ہوں کہ اسلامائزیشن کے حوالہ سے

دنیا بھر کے دینی کارکن اور اسلامی تحریکات سب سے زیادہ پاکستان سے توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں اور اس سلسلہ میں ان کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ ۱۰/اکتوبر کے الیکشن کے بعد تین الگ الگ عرب ملکوں سے تعلق رکھنے والے دانشوروں نے مجھے یہ سمجھ کر صوبہ سرحد کا کاروبار بہتر چلانے کے لیے متعدد مشوروں سے نوازا کہ ان معاملات سے شاید میرا بھی کوئی عملی تعلق ہے یا میں بھی اس سلسلہ میں کوئی کردار ادا کر سکتا ہوں۔ ایک عرب دانشور کا کہنا ہے کہ صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کے وزرائے کرام کو عوام کے روزمرہ مسائل کے حل میں زیادہ دلچسپی لینی چاہیے۔ ذاتی کردار کے حوالہ سے دیانت، خدمت اور سادگی کی روایات کو زندہ کرنا چاہیے حکمرانوں اور عوام کے درمیان قائم کئے گئے مصنوعی فاصلوں کو کم کرنا چاہیے اور ایک ایسی دیانت دار، کفایت شعار، خدمت گزار اور باصول حکومت کا نقشہ پیش کرنا چاہیے جو دوسری حکومتوں سے واقعتاً مختلف دکھائی دے اور آئندہ الیکشن میں ملک کے دوسرے صوبوں کے عوام بھی صوبہ سرحد کے عوام کی پیروی کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ صوبہ سرحد میں اس سے قبل مولانا مفتی محمودؒ بھی دس ماہ تک وزیر اعلیٰ رہ چکے ہیں۔ ان کا دور اگرچہ عبوری آئین کا دور تھا، ابھی ۷۳ء کا دستور نہیں آیا تھا اور مرکز اور صوبوں کے تعلقات کار اور تقسیم کار کا حتمی طور پر فیصلہ نہیں ہوا تھا جبکہ مفتی صاحب صوبہ میں حکومت کے سربراہ ہونے کے ساتھ ساتھ دستور ساز اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر خان عبدالولی خان کے سرگرم رفیق کار کی حیثیت سے ایک فعال اپوزیشن راہنما کا کردار بھی ادا کر رہے تھے۔ ان کے حکومتی معاملات میں مرکز کی مداخلت کا یہ حال تھا کہ شراب پر پابندی جیسے مسئلہ پر ان کے پورے دور حکومت میں مرکز ان سے مسلسل خط و کتابت کرتا رہا جس کا مقصد ان پر دباؤ ڈال کر اس معاملہ میں انہیں اپنی پالیسی میں لچک پیدا کرنے پر مجبور کرنا تھا۔

مولانا مفتی محمودؒ نے ہمیں خود بتایا کہ انہوں نے وزارت اعلیٰ کا حلف اٹھاتے ہی جب صوبہ سرحد میں شراب کی تیاری، فروخت اور استعمال پر پابندی لگانے کا اعلان کیا تو مرکز نے ایک مراسلہ میں ان سے کہا کہ شراب کی مد میں صوبائی حکومت کو ٹیکس کی جو آمدنی ہوتی تھی وہ اس پابندی کی وجہ سے بند ہو جائے گی اور اس خسارہ کو پورا کرنے کے لیے مرکز ان کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔ مفتی

صاحب نے جواب دیا کہ کوئی بات نہیں ہم اپنے اخراجات میں کمی کر کے یہ خسارہ پورا کرلیں گے۔اس کے بعد مرکز کا دوسرا خط آیا کہ غیر مسلموں کے ہاں شراب حرام نہیں ہے اسی لیے ان کے لیے بڑے شہروں میں شراب کی چند دکانیں کھول دینی چاہئیں۔مفتی صاحبؒ نے اس کا جواب دیا کہ غیر مسلموں کو شراب پینے کی اجازت ہوسکتی ہے لیکن انہیں شراب مہیا کرنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔

اس کے بعد مرکز سے تیسرا خط آیا کہ بعض بیماریوں میں شراب بطور دوا استعمال ہوتی ہے اس لیے گنجائش کی کوئی صورت نکالنا ضروری ہے۔مفتی صاحب نے اس کے جواب میں صوبائی ہیلتھ سیکرٹری کی سربراہی میں ایک میڈیکل بورڈ بنا دیا اور اس کے ذمہ لگایا کہ وہ ایسی بیماری کی نشاندہی کرے جو مہلک ہو اور جس کا شراب کے علاوہ کوئی متبادل علاج نہ ہو۔مفتی صاحب کا ارشاد یہ تھا کہ اگر واقعی ایسی کوئی بیماری موجود ہے جو مہلک ہے اور شراب کے علاوہ اس کا کوئی متبادل علاج نہیں ہے تو وہ ایسی بیماری کے لیے ہسپتالوں میں شراب کے استعمال کی اجازت دینے کے لیے تیار ہیں ،لیکن میڈیکل بورڈ کی رپورٹ یہ تھی کہ ایسی کوئی بیماری سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔مولانا مفتی محمودؒ نے اس طرح کی رکاوٹوں ،مشکلات اور مداخلت کے باوجود نہ صرف کاروبار حکومت کامیابی کے ساتھ چلایا بلکہ مرکز میں اپوزیشن راہ نما کا رول بھی باوقار طریقہ سے نبھایا،سادگی اور کفایت شعاری کا نقشہ پیش کیا اور پھر اصولوں کی خاطر ازخود اقتدار سے الگ ہوکر دنیا کو بتادیا کہ اہل حق اور اہل دین کے نزدیک اقتدار مقصد نہیں بلکہ مقاصد کے حصول کے لیے صرف ایک ذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

جناب اکرم درانی نے مولانا مفتی محمودؒ کی یہ سیٹ سنبھالی ہے اور خوش قسمتی سے ان کا تعلق بھی مفتی صاحب ہی کی جماعت سے ہے اس لیے لوگ ان سے بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ کی حیثیت سے نہ صرف مولانا مفتی محمودؒ کی روایات کو زندہ کریں گے بلکہ ان کے مشن کو عملاً آگے بڑھانے کے لیے بھی سنجیدہ محنت کریں گے۔مفتی صاحبؒ کی پشت پر تو مینڈیٹ بھی اتنا بڑا نہیں تھا اور چالیس کے ایوان میں ان کی اپنی پارٹی کی سیٹیں صرف چھ تھیں باقی سب کچھ ان کی حکمت وتدبر کا کرشمہ تھا۔اکرم درانی ان سے کہیں زیادہ بھاری مینڈیٹ کے ساتھ حوصلہ

اوراعتماد کے ساتھ اپنے منشور کی طرف پیش رفت کر سکتے ہیں، البتہ ''حکمت وتدبر'' کیے بارے میں انہیں مولانا مفتی محمودؒ ہی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اور انہی سے راہ نمائی حاصل کرنا ہوگی۔ اگر انہوں نے ایسا کرنے کا اہتمام کرلیا تو ان شاء اللہ تعالیٰ متحدہ مجلس عمل اپنے ووٹروں کے ہاں سرخرو ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے مشن اور منشور کے ساتھ بھی صحیح طور پر انصاف کر سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس میں کامیابی اور سرخروئی عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، ۱۰ر دسمبر ۲۰۰۲ء)

پاکستان میں نفاذ اسلام کی ترجیحات

اور سرحد حکومت کی حکمت عملی

گزشتہ دنوں لاہور کے ہمدرد سنٹر میں ایک سیمینار میں شرکت کا موقع ملا۔اس سیمینار کا اہتمام ''مجلس فکر ونظر'' نے کیا تھا جو پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامی کے اساتذہ نے اگست ۲۰۰۰ء سے قائم کر رکھی ہے اور اس کے تحت عصری مسائل پر اسلامی تناظر میں غور وفکر کے لیے سہ ماہی علمی مجالس کا انعقاد کیا جاتا ہے۔سیمینار کا موضوع ''پاکستان میں نفاذ اسلام کی ترجیحات'' تھا۔اس میں متحدہ مجلس عمل کے رہنما حافظ حسین احمد ایم این اے اور صوبہ سرحد کی متحدہ مجلس عمل کے نائب صدر پروفیسر محمد ابراہیم مہمانان خصوصی تھے جبکہ مجھے شاید اس خیال سے صدارت کی کرسی پر بٹھا دیا گیا تھا کہ کہیں درمیان میں اٹھ کر چلا نہ جاؤں جیسا کہ عام طور پر ایسا ہوجاتا ہے۔

سیمینار میں ''مجلس فکر ونظر'' کے سیکرٹری پروفیسر ڈاکٹر محمد امین نے مجلس کے اغراض ومقاصد اور سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور سیمینار کے سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیے۔ڈاکٹر صاحب موصوف پنجاب یونیورسٹی کے اردو دائرہ معارف اسلامیہ (اسلامی انسائیکلو پیڈیا) کے سینئر ایڈیٹر ہیں اور علمی وادبی حلقوں میں نمایاں تعارف رکھتے ہیں۔تحریک اسلامی پاکستان کے امیر حکیم سید محمود احمد سرو سہارنپوری، ریٹائرڈ جسٹس عبد الحفیظ چیمہ، بادشاہی مسجد لاہور کے خطیب پروفیسر ڈاکٹر محمود الحسن عارف، پروفیسر عبد الجبار شاکر، جناب کے ایم اعظم، پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ ابلاغیات کے ڈاکٹر مغیث الدین شیخ اور دیگر ارباب دانش نے نفاذ اسلام کی اہمیت اور اس کی حکمت عملی کے حوالے سے

مختلف امور پر اظہار خیال کیا اور حافظ حسین احمد اور پروفیسر محمد ابراہیم نے اس سلسلے میں متحدہ مجلس عمل کی حکمت عملی، صوبہ سرحد اور بلوچستان کی تازہ ترین صورت حال اور دونوں صوبائی حکومتوں کے عزائم پر روشنی ڈالی۔

حافظ حسین احمد صاحب نے تفصیل کے ساتھ گفتگو کی اور شرکائے مجلس نے گہری توجہ کے ساتھ ان کی باتوں کو سنا جو متحدہ مجلس عمل کی پالیسیوں اور طریق کار کی وضاحت پر مشتمل تھی۔ مجھ کافی عرصہ کے بعد حافظ صاحب کی تفصیلی اور سنجیدہ گفتگو سننے کا موقع ملا اور یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ پہلے کی نسبت زیادہ متانت اور استدلال کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اعلیٰ ذہانت کے سامنے غور و فکر کے نئے پہلے رکھنے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہیں۔ ان کی گفتگو کے اختتام پر ایک ممتاز دانش ور اور فاضل دوست نے اس بات پر زور دیا کہ اس قسم کی مجالس کا اہتمام ملک کے ہر بڑے شہر میں ہونا چاہیے۔ متحدہ مجلس عمل کے قائدین کو حافظ حسین احمد کی طرح ایسی مجالس میں ارباب علم ودانش کے درمیان بیٹھ کر انھیں اپنی پالیسی اور طریق کار کے بارے میں بریف کرنا چاہیے اور چاروں طرف پھیلے ہوئے شکوک وشبہات کے ازالہ کے لیے محنت کرنی چاہیے۔

خود میں اس حوالے سے کافی دنوں سے کنفیوژن کا شکار تھا کہ دستور پاکستان کی ترمیم شدہ اور بحال کی جانے والی دفعات کی روشنی میں اس وقت وفاق اور صوبوں کے تعلقات کار کی نوعیت کیا ہے اور صوبائی حکومتیں دستور میں دیے گئے کون سے اختیارات کو استعمال کرنے کی پوزیشن میں ہیں؟ حافظ حسین احمد کی گفتگو سے بات صاف ہوئی اور معلوم ہوا کہ جس طرح وفاق میں پارلیمنٹ اور کابینہ دونوں اپنے دستوری اختیارات کے استعمال کے لیے ''فرد واحد'' کے اشاروں کے محتاج ہیں، اسی طرح صوبائی حکومتوں اور اسمبلیوں کا حال بھی ان سے مختلف نہیں ہے اور جس طرح آج کے عالمی نظام اور ورلڈ سسٹم میں دنیا کے کسی کونے میں کوئی اہم کام امریکا کی مرضی کے بغیر نہیں ہو پاتا، اسی طرح پاکستان کے نئے داخلی نظام میں بھی قومی زندگی کے کسی شعبے کا کوئی اہم کام ایوان صدر کے این او سی کے بغیر نہیں ہو سکے گا۔

مجھے تو یہ بات اسی دن کھٹک گئی تھی جس روز پی سی او کے تحت عدالت عظمیٰ کے جج صاحبان

سے نیا حلف لینا ضروری سمجھا گیا تھا اور میں نے اپنے ایک مضمون میں عرض کر دیا تھا کہ یہ شخصی وفاداری کا حلف ہے جس کے بعد پاکستان ایک طرح کی بادشاہت کے دور میں داخل ہو گیا ہے، مگر ہمارے بہت سے دانش وروں کے اصرار تھا کہ اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے اور ملک کے نظام کی ''اصلاح'' کے لیے اس کڑوی گولیل کو وقتی طور پر نگل لینا ہماری مجبوری ہے، مگر آج وہی دانش ور اور کالم نگار عدالت عظمیٰ کے جج صاحبان کو دستور کے تحت نیا حلف دلانے پر زور دے رہے ہیں اور اس کے لیے اپنا پورا زور قلم صرف کر رہے ہیں جبکہ مجھے اس پر پنجابی کا ایک مشہور محاورہ یاد آ رہا ہے کہ ''ویلے دی نماز تے کویلے دیاں ٹکراں''، یعنی نماز کو اس کے وقت میں اہتمام کے ساتھ پڑھا جائے تو وہ نماز ہوتی ہے لیکن اگر اس کا وقت گزر جائے اور اس کے بعد نماز کو جلدی جلدی نمٹانے کی کوشش کی جائے تو وہ ''ٹکریں'' بن جاتی ہے۔

حافظ صاحب نے ''ترجیحات'' کے لفظ سے اختلاف کیا اور کہا کہ دین مکمل ہو جانے کے بعد اس کے نفاذ کے لیے ترجیحات کی بات کرنا درست نہیں اور پھر یہ ترجیحات تو ہم گزشتہ پچپن برس میں بھی نہیں طے کر پائے، اس لیے وہ اس کے لیے ترجیحات کے بجائے ''حکمت عملی'' کی اصطلاح کو ترجیح دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ دین کو مکمل طور پر نافذ کیا جائے گا تو وہی دین ہوگا۔ کسی نامکمل کام پر نفاذ اسلام کا اطلاق کرنا ٹھیک نہیں ہوگا، البتہ اس کے لیے ہمیں صحیح حکمت علی اور طریق کار کا ضرور جائزہ لینا چاہیے اور ہم اس کے لیے قدم قدم پر اہل علم ودانش کے مشورہ اور راہ نمائی کے محتاج ہیں۔

پروفیسر محمد ابراہیم نے سرحد کی صوبائی حکومت کے عزائم اور اس کی راہ میں حائل مشکلات کا جائزہ پیش کیا اور کہا کہ ہم پوری احتیاط کے ساتھ پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہے ہیں اور ہمیں ان مشکلات اور رکاوٹوں کا پوری طرح ادراک واحساس ہے جو نفاذ اسلام کی طرف عملی پیش رفت میں حائل ہو سکتی ہیں، لیکن دینی جماعتوں کے اتحاد اور رائے عامہ کی بھرپور حمایت کی وجہ سے ہمیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مشکلات سے ہمیں ضرور نجات دلائیں گے اور ہم اپنے منشور اور اعلانات کے مطابق اپنی استطاعت اور اختیارات کے دائرے میں رہتے ہوئے صوبہ سرحد میں نفاذ اسلام کے لیے کچھ نہ کچھ کام ضرور کر سکیں گے۔

سیمینار کے مقررین کا زیادہ زور اس بات پر رہا کہ متحدہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت کو عوام کی مشکلات میں کمی اور ان کے روزمرہ مسائل کے حل کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے، وی آئی پی اور پروٹوکول کلچر کے جال سے نکلتے ہوئے سول سروس کو عوام کا خادم بنانا چاہیے کیونکہ عام آدمی کا یہ اعتماد بحال کرنا سب سے زیادہ ضروری ہے کہ اسلامی نظام نافذ ہونے کی صورت میں اس کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت ہوگی، اس کی مشکلات کم ہوں گی، باعزت زندگی کے مواقع فراہم ہوں گے، اس کے روزمرہ مسائل حل ہوں گے، اسے انصاف ملے گا اور وہ پہلے سے زیادہ بہتر ماحول میں زندگی گزار سکے گا۔

راقم الحروف نے اپنی گزارشات میں یہ عرض کیا کہ موجودہ معروضی حالات میں نفاذ اسلام کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے تین امور کا اہتمام ضروری ہے۔ ان میں سے پہلے دو کام ہم سب کے کرنے کے ہیں اور ان کے لیے ملک کے ہر اس شہری کو عملی کردار ادا کرنا چاہیے جو پاکستان میں نفاذ اسلام کا خواہاں ہے، جبکہ تیسرا کام صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت کے کرنے کا ہے اور اسے بھی پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

☆ قیام پاکستان کے بعد سے ہی نفاذ اسلام کے عمل کے گرد دو سرخ دائرے کھینچ دیے گئے تھے جو کچھ عرصہ پہلے تک ظاہری طور پر نظر نہیں آتے تھے لیکن اب ہر ذی شعور شہری کو دکھائی دینے لگے ہیں۔ ایک سرخ دائرہ ملک کی داخلی اسٹیبلشمنٹ کا کھینچا ہوا ہے جو نفاذ اسلام کی کسی بھی عملی کوشش کو روکنے اور محدود رکھنے کے لیے ہے اور دوسرا دائرہ ورلڈ اسٹیبلشمنٹ نے اس کے اوپر قائم کر رکھا ہے کہ اگر کسی وقت نفاذ اسلام کی کوئی کوشش عوامی دباؤ کی وجہ سے پہلے سرخ دائرے کو کراس کر ہی لے تو اسے دوسری دفاعی لائن پر روک لیا جائے۔ چنانچہ گزشتہ نصف صدی کے دوران پاکستان میں نفاذ اسلام کی ہر کوشش کے ساتھ چوہے بلی کا یہی کھیل جاری ہے۔ اس لیے نفاذ اسلام کے حوالے سے ہماری سب سے پہلی اور اولین ضرورت ان سرخ دائروں سے نجات حاصل کرنا ہے، کیونکہ ان کے ہوتے ہوئے نفاذ اسلام کا کوئی قدم بھی کامیابی کی طرف اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکے گا اور ان منحوس سرخ دائروں سے نجات حاصل کرنے کے لیے قومی سطح پر جدوجہد اور رائے عامہ کو ملک گیر سطح

پر منظّم کرنے کی ضرورت ہے جس کے لیے ہم سب کو اپنے اپنے دائرۂ کار میں متحرک ہونا پڑے گا۔

☆ اسلامی نظام اور قوانین کے خلاف عالمی لابیوں اور عالمی ذرائع ابلاغ کی منفی مہم اور معاندانہ پراپیگنڈے کے توڑ کے لیے علمی مراکز، دینی اداروں اور فکری حلقوں کو مربوط اور منظّم محنت کرنی چاہیے اور یہ بھی ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔

☆ صوبہ سرحد کی حکومت کو دستوری ماہرین کی مشاورت سے موجودہ دستوری صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے دائرۂ اختیار کا تعین کرنا چاہیے اور جن اختیارات کو وہ موجودہ حالات میں استعمال کر سکتی ہے، ان سے متعلقہ معاملات کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو منتخب کر کے صوبائی اسمبلی کے ذریعے سے ان پر قانون سازی کا آغاز کر دینا چاہیے۔

میرے خیال میں صوبہ سرحد کی حکومت سر دست صرف یہی کر سکتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر متحدہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت اور صوبائی اسمبلی اپنے بس کا کام کر گزرے گی تو اگلے مراحل کا راستہ بھی اللہ تعالیٰ ضرور آسان فرما دیں گے کہ اس قادر مطلق کا قانون وضابطہ یہی ہے۔

(روزنامہ اسلام، ۲۹ جنوری ۲۰۰۳)

پاکستان میں نفاذ اسلام کی ترجیحات

[۲۱ جنوری ۲۰۰۳ء کو ہمدرد سنٹر لٹن روڈ لاہور میں ''مجلس فکر ونظر'' کے زیر اہتمام ''پاکستان میں نفاذ اسلام کی ترجیحات'' کے موضوع پر منعقد ہونے والے سیمینار میں پڑھا گیا۔]

نحمده تبارك وتعالىٰ ونصلي ونسلم علىٰ رسوله الكريم وعلىٰ آله وأصحابه وأتباعه أجمعين۔

نفاذ اسلام کی جدوجہد کے ایک نظریاتی کارکن کی حیثیت سے مجھے یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی ہے کہ پنجاب یونیورسٹی میں اسلامی علوم کی تعلیم وتدریس سے متعلق اساتذہ نے اگست ۲۰۰۰ء سے ''مجلس فکر ونظر'' کے نام سے ایک علمی فورم قائم کر رکھا ہے جس میں عصری مسائل پر اسلامی تناظر میں غور کیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان بننے کے بعد سے اب تک نفاذ اسلام کے علمی وفکری تقاضوں اور عصری مسائل کے اسلامی تناظر میں تجزیہ وحل کے لیے غیر سرکاری سطح پر کوئی اجتماعی کام منظم نہیں ہو سکا اور اگرچہ اس حوالہ سے شخصی حوالوں سے اچھا خاصا کام سامنے آیا ہے مگر شخصی فکر اور عقیدت کے دائروں میں محدود ہونے کی وجہ سے قوم کی اجتماعی زندگی میں اس کے خاطر خواہ ثمرات مرتب نہیں ہو سکے اور نفاذ اسلام کے محاذ پر علمی وفکری ہوم ورک کا خلا بدستور ارباب علم ودانش کو کھٹک رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ جس طرح قیام پاکستان کے فوراً بعد تمام مکاتب فکر کے ۳۱ سرکردہ علماء کرام نے ۲۲ دستوری نکات مرتب کر کے نفاذ اسلام کے حوالہ سے اجتماعی علمی سوچ اور فکر کا عملی مظاہرہ کیا تھا، اس کا تسلسل قائم رہتا اور اسی جذبہ اور شعور کے ساتھ عصری مسائل کے حل کے ساتھ

ساتھ نفاذ اسلام کی راہ میں حائل رکاوٹوں اور مشکلات سے نمٹنے کی علمی جدوجہد کی جاتی لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہوسکا اور ہماری نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط قومی زندگی میں علماء کرام کے مذکورہ ۲۲ متفقہ دستوری نکات کے بعد اگر کوئی اجتماعی علمی کاوش نظر آتی ہے تو وہ ۱۹۷۳ء کے دستور میں اسلامی دفعات کی شمولیت' قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے' صدر ضیاء الحق مرحوم کے دور میں وفاقی شرعی عدالت کے قیام' حدود آرڈیننس کے نفاذ اور اس نوعیت کے دیگر چند اقدامات تک محدود ہے یا اس سلسلہ میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات اور وفاقی شرعی عدالت کے متعدد فیصلوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے مگر جب ہم نفاذ اسلام کے سلسلہ میں عالمی سطح پر پائے جانے والے ہمہ گیر شکوک و شبہات اور مختلف عالمی حلقوں کی تشویش و اضطراب کے تناظر میں نفاذ اسلام کی اصل علمی وفکری ضروریات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ کام قطعی طور پر ناکافی دکھائی دیتا ہے۔ بالخصوص جدید علمی وفکری چیلنجز کے پس منظر میں اجتماعی علمی وفکری جدوجہد کا خلا پوری شدت کے ساتھ اپنے وجود کا احساس دلاتا رہتا ہے۔

میری ایک عرصہ سے یہ کوشش اور خواہش رہی ہے کہ قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کی تعلیم و تدریس کے ساتھ گہرا تعلق رکھنے والے علما اور جدید علوم وفنون بالخصوص قانونی نظام سے تعلق رکھنے والے ارباب دانش کے مشترکہ علمی فورم تشکیل پائیں اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے طرز اجتہاد کا احیا کرتے ہوئے مسائل کے تجزیہ وتحلیل اور حل کے لیے مشاورتی طریق کار کا راستہ اختیار کیا جائے لیکن متعدد مواقع پر اس کے لیے آواز اٹھانے اور متعلقہ حضرات کو توجہ کے باوجود پیش رفت کی کوئی صورت دکھائی نہیں دی۔ اس پس منظر میں ''مجلس فکر ونظر'' کے قیام پر مجھے جس قدر خوشی ہوسکتی ہے، اسے الفاظ میں بیان کرنا مجھے مشکل محسوس ہورہا ہے تاہم اس میں یہ کمی میرے خیال میں ابھی تک موجود ہے کہ دینی مدارس کے سینئر اساتذہ اور قانونی شعبہ سے تعلق رکھنے والے ماہرین سے استفادہ کی شاید ضرورت محسوس نہیں کی گئی یا ان سے رابطہ کا کوئی قابل عمل طریقہ طے نہیں پا سکا۔ لیکن اس حوالہ سے اپنے احساسات وتاثرات کے اظہار پر خود کو مجبور پا رہا ہوں اور اس پر ''مجلس فکر ونظر'' سے معذرت خواہ ہوں۔

جہاں تک پاکستان میں نفاذ اسلام کی ترجیحات پر گفتگو کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اب تک ہونے والے کام پر ایک نظر ڈال لی جائے تو آئندہ ترجیحات پر غور ہمارے لیے آسان ہو جائے گا۔

☆ ملک کے دستور کی بنیاد ''قرارداد مقاصد'' پر ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کو تسلیم کر کے قرآن وسنت کی حدود میں رہتے ہوئے عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعہ ملک کا نظام چلانے کی ضمانت دی گئی ہے۔ اسی حوالہ سے یہ ملک ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کہلاتا ہے اور اسی بنیاد پر پاکستان کو ایک نظریاتی اسلامی ریاست کا مقام حاصل ہے۔

☆ دستور میں اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا ہے۔

☆ قرآن وسنت کے منافی قوانین نافذ نہ کیے جانے اور تمام قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق ڈھالنے کا دستوری وعدہ کیا گیا ہے۔

☆ مروجہ قوانین کی اسلامی حیثیت کے تعین کے لیے وفاقی شرعی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل کے نام سے دو دستوری ادارے کام کر رہے ہیں۔

☆ اسلامی نظریاتی کونسل ملک کے تمام مروجہ قوانین کا جائزہ لے کر انہیں قرآن وسنت کے مطابق ڈھالنے کے لیے ایک جامع رپورٹ پیش کر چکی ہے۔

☆ وفاقی شرعی عدالت نے متعدد قوانین کے بارے میں واضح فیصلے صادر کر رکھے ہیں۔

☆ قومی اسمبلی اور سینٹ آف پاکستان مختلف مواقع پر قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لا قرار دینے کا بل الگ الگ طور پر منظور کر چکی ہیں۔

مگر اس سب کچھ کے باوجود نفاذ اسلام کی دلّی ابھی بہت دور ہے اور اس کے قریب آنے کا سر دست کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ملک کا موجودہ نظام جن طبقات کی گرفت میں ہے اور جو گروہ پاکستان کے مروجہ سسٹم کا کنٹرول پوری قوت کے ساتھ اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے ہیں، ان میں سے کوئی طبقہ بھی نفاذ اسلام کے لیے سنجیدہ نہیں ہے اور وہ اسے قوم کو بہلانے کے لیے ایک کھلونے سے زیادہ کوئی حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس طبقہ

میں سول اور ملٹری بیوروکریسی کے ساتھ جاگیرداراور اعلیٰ مراعات یافتہ گروہ بھی شامل ہیں اور انہیں پاکستان میں نفاذ اسلام کا ہر قیمت پر راستہ روکنے کے لیے عالمی استعمار اور ورلڈ اسٹیبلشمنٹ کی بھرپور حمایت اور پشت پناہی حاصل ہے۔ اس لیے میرے نزدیک نفاذ اسلام کے لیے جدوجہد کرنے والی جماعتوں اور طبقات کی ترجیحات میں سب سے پہلے اس بات کو اہمیت حاصل ہونی چاہیے کہ مروجہ نظام کی حفاظت کے لوکل اور ورلڈ اسٹیبلشمنٹ کے قائم کردہ حصار اور ریڈ لائن کو کیسے توڑا جائے؟ کیونکہ اس حصار کو توڑے بغیر اور مروجہ نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ کیے بغیر نفاذ اسلام کا کوئی سنجیدہ قدم آگے نہیں بڑھ سکتا اور نہ ہی نظام میں تبدیلی کی کوئی کوشش کامیاب ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد تاریخ اسلام سے دو تین مواقع کا تذکرہ کرنا چاہوں گا جب چند نیک دل حکمرانوں کو بگڑے ہوئے نظام کی اصلاح کا موقع ملا اور انہوں نے اس بگڑے ہوئے نظام کی اصلاح کے لیے پوری دیانت داری کے ساتھ پیش رفت کی۔ ہو سکتا ہے ان کے اقدامات اور طرز عمل سے ہمارے لیے راہ نمائی کا کوئی راستہ نکل آئے۔

پہلے نمبر پر حضرت عمر بن عبد العزیزؒ ہیں جنہوں نے پہلی صدی ہجری کے اختتام پر خلافت کی ذمہ داری قبول کی جبکہ ملکی نظام میں خاصا بگاڑ آچکا تھا۔ عوامی حاکمیت کی بجائے حکمران طبقہ وجود میں آ گیا تھا۔ وی آئی پی کلچر نے مسلمان سوسائٹی میں اپنی جگہ بنالی تھی اور قومی خزانے کی لوٹ کھسوٹ کا یہ عالم تھا کہ بعض مؤرخین کے بقول بیت المال یعنی قومی خزانے کے اسی فی صد اموال اور اثاثے شاہی خاندان اور مراعات یافتہ طبقوں کی تحویل میں تھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے برسر اقتدار آنے کے بعد اس صورت حال کی اصلاح کے لیے جو اقدامات کیے، ان کی فہرست طویل ہے لیکن ان میں چند اہم اقدامات یہ ہیں:

☆ قومی خزانے کی رقوم اور اثاثوں کی واپسی کا آغاز اپنی ذات اور گھر سے کیا اور پھر کسی رو رعایت کے بغیر تمام متعلقہ لوگوں سے قومی خزانے کی رقوم اور اثاثے سختی کے ساتھ واپس لے لیے۔

☆ سابق حکمرانوں نے رعایا پر جو ناجائز ٹیکس عائد کر رکھے تھے، وہ ختم کر دیے اور عام لوگوں کو سرکاری عمال کی لوٹ کھسوٹ سے نجات دلائی۔

☆وی آئی پی کلچر کا خاتمہ کیا اور پروٹوکول اور پرسٹیج کے ضابطے ختم کردیے۔

☆خود بھی عام لوگوں جیسی سادہ زندگی اور رہن سہن اختیار کیا اور دوسرے سرکاری حکام کو بھی عام لوگوں جیسے معیار زندگی کی طرف واپس آنے پر مجبور کیا۔

☆قانون کی عملداری بحال کی اور سرکاری عمال کو پابند کیا کہ وہ کسی شخصیت‘ طبقہ یا خاندان کی پروا کیے بغیر قرآن وسنت کے مطابق تمام امور کے فیصلے کریں۔

چھٹی صدی ہجری میں ایک نیک دل حکمران سلطان نور الدین زنگیؒ نے شام کی حکومت کا کنٹرول حاصل کیا تو اسے بھی ایک بگڑے ہوئے نظام کا سامنا تھا اور اس نے اصلاح احوال کے لیے جو طریقے اختیار کیے، ان میں سے چند ایک کا مؤرخین اس طرح ذکر کرتے ہیں:

☆جزیہ اور خراج کے سوا تمام ٹیکس منسوخ کر دیے۔

☆عام ضرورت کی تمام اشیا کو چونگی اور ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔

☆منکرات وفواحش اور بدکاری و بے حیائی کے خاتمہ کے لیے سخت گیر پالیسی اختیار کی۔

☆سرکاری خرچ پر مفت شفا خانہ قائم کیا۔

☆دمشق میں علم حدیث کی تعلیم کے لیے مستقل مدرسہ قائم کیا جو عالم اسلام کا پہلا ’’سرکاری دارالحدیث‘‘ کہلاتا ہے اور جس کے شیخ الحدیث معروف محدث حافظ ابن عساکرؒ تھے۔

☆خراسان کے معروف ریاضی دان قطب الدین نیشاپوریؒ کو دمشق میں بلوا کر بڑی درسگاہ قائم کی۔

بارہویں صدی ہجری کے دوران جب ہندوستان میں مغل بادشاہت کا چراغ بتدریج گل ہو رہا تھا، جنوبی ہند کی ریاست میسور میں سلطان ٹیپوؒ نے اقتدار سنبھالا تو اسے ایک زوال پذیر معاشرے سے سابقہ درپیش تھا اور وہ جنوبی ایشیا میں برطانوی استعمار کے تیزی سے بڑھتے ہوئے قدموں کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس نے میسور کی سلطنت خداداد کو ایک خوشحال اور مستحکم اسلامی ریاست بنانے کی ہر ممکن کوشش کی‘ تجارت وزراعت کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ دفاع اور اسلحہ سازی کی طرف خصوصی توجہ دی اور جہاز سازی کے میدان میں پیش رفت کر کے عسکری قوت

میں فرنگی استعمار کے بالمقابل آنے کا عزم کیا۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ اگر ٹیپو شہیدؒ کو اس کی خواہش کے مطابق ترکی کی خلافت عثمانیہ کی سرپرستی حاصل ہو جاتی اور میسور کی پڑوسی مسلم ریاستیں اس کے مقابلہ میں فرنگی حکمرانوں کا ساتھ نہ دیتیں تو سلطان ٹیپوؒ کی حکمت عملی اور عزم میں اتنی قوت تھی کہ وہ جنوبی ایشیا کے ایک بڑے حصے کو برطانوی استعمار کے نو آبادیاتی تسلط سے آزاد رکھنے میں کامیاب ہو جاتا۔ مگر خلافت عثمانیہ اور ریاست حیدر آباد دونوں نے اس مرد غیور کا ساتھ دینے اور اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھنے کے بجائے انگریزوں کا ساتھ دینے کو ترجیح دی جس کی وجہ سے نہ صرف سلطان ٹیپوؒ کو جام شہادت نوش کرنا پڑا بلکہ جنوبی ایشیا کی یہ اسلامی ریاست بھی تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہو گئی۔

ہمیں پاکستان میں اس سے کہیں زیادہ سنگین صورت حال درپیش ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ اور سلطان نور الدین زنگیؒ کے سامنے ایک بگڑے ہوئے نظام کی اصلاح کا مشن تھا جو انہوں نے اپنے خلوص، دیانت اور کردار کی بدولت پورا کر دکھایا جبکہ سلطان ٹیپوؒ کے سامنے اپنی سلطنت کی آزادی کو بچانے اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے مستقبل کا سوال تھا جسے وہ حل نہ کر سکا مگر اپنی جان کا نذرانہ دے کر اس نے مسلمانوں کو اپنی آزادی، خود مختاری اور اسلامی تشخص کے تحفظ کی جدوجہد کا راستہ بتا دیا۔ ہمارے سامنے یہ دونوں چیلنج ہیں اور پہلے سے کہیں زیادہ سنگین اور خوفناک شکل میں ہیں۔ اس لیے پاکستان میں نفاذ اسلام کی جدوجہد کرنے والوں کو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، سلطان نور الدین زنگیؒ اور سلطان ٹیپو شہیدؒ کے کردار، عزم اور حوصلہ و استقامت سے راہ نمائی حاصل کرنا ہوگی اور محض ''روایتی سیاسی عمل'' پر قناعت کرنے کی بجائے ایک ملی و دینی مشن کے طور پر اس کے طریق کار اور ترجیحات کا تعین کرنا ہوگا۔

آخر میں صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت کے حوالہ سے بھی کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ نہ صرف پاکستان کے عوام بلکہ دنیا بھر کی دینی تحریکات اور دینی کارکنوں کی نظریں ان پر لگی ہوئی ہیں اور افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کے جبری خاتمہ نے دنیا بھر کے دینی کارکنوں کے دلوں پر جو زخم لگائے ہیں، وہ صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی کامیابی کو اپنے زخموں پر

مرہم کی طرح محسوس کر رہے ہیں۔ میں اس سلسلہ میں اپنے ذاتی مشاہدہ کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۲ء کے انتخابات کے موقع پر میں لندن میں تھا۔ انتخابات کے نتائج سامنے آنے پر کم از کم چھ مختلف ملکوں کے مسلم دانش وروں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور مبارک باد دیتے ہوئے اپنے جذبہ اور خلوص کے مطابق صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی متوقع حکومت کو کامیاب بنانے کے لیے بہت سے مشورے دیے۔ انہیں یہ غلط فہمی تھی کہ شاید متحدہ مجلس عمل میں مجھے بھی ایسی حیثیت حاصل ہے کہ میں اس کی قیادت کو پالیسی اور ترجیحات کے معاملہ میں کوئی مشورہ دے سکتا ہوں اور اسی وجہ سے وہ مجھے مفید مشوروں سے نواز رہے تھے جبکہ میں اس بات پر خوش تھا کہ متحدہ مجلس عمل کو صرف پاکستان کے دین دار عوام ہی نہیں بلکہ مختلف ملکوں کے مسلمان دانش ور بھی اپنی جماعت سمجھ رہے ہیں اور اس سے توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ ان سب دوستوں کے مشوروں کا خلاصہ یہ تھا کہ:

☆ متحدہ مجلس عمل کو صوبہ سرحد میں ایک مثالی عوامی اور اسلامی حکومت کا عملی نقشہ پیش کرنا چاہیے۔

☆ عوامی مسائل کے حل اور مشکلات کے خاتمہ کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

☆ سماجی انصاف اور معاشرتی عدل کی فراہمی کو اولیت دینی چاہیے۔

☆ پروٹوکول، پرسٹیج اور وی آئی پی کلچر کے عذاب سے لوگوں کو نجات دلانا چاہیے۔

☆ صوبائی وزراء کو قناعت، سادگی اور قانون کی یکساں عملداری کا اپنی ذاتی زندگی میں نمونہ بننا چاہیے۔

☆ ناانصافی، رشوت، بدعنوانی اور سرخ فیتہ کی لعنت کے خاتمہ کے لیے سنجیدہ اقدامات کرنے چاہئیں۔

☆ عام لوگوں میں اپنی مدد آپ کے تحت سماجی کاموں کا شعور بیدار کرنا چاہیے اور ہر لحاظ سے دوسرے صوبوں اور دوسری سیاسی جماعتوں کے وزرا سے متحدہ مجلس عمل کے وزرا کو الگ اور ممتاز نظر آنا چاہیے تاکہ وہ نہ صرف اپنے صوبہ میں عوام کو عدل وانصاف کا صحیح ماحول فراہم کرسکیں بلکہ ان

کا کردار اور حکومتی طرزِ عمل ملک کے دوسرے صوبوں کے عوام کے لیے بھی باعث کشش ہو اور پورے پاکستان کے عوام عملاً یہ محسوس کریں کہ ان کی فلاح و بہبود اور بہتر مستقبل اسلامی نظام اور دینی قیادت ہی سے وابستہ ہے۔

ان مشوروں کے ساتھ میں اپنی طرف سے سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت کے لیے ایک مشورہ کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامائزیشن کا بہت سا کام اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کی شکل میں موجود ہے۔ صرف آئین کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لے کر صوبائی اختیارات کی حدود واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کام کے بعد صوبائی اختیارات سے تعلق رکھنے والی اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو چھانٹ لیجیے اور متعلقہ ماہرین کی مشاورت سے ترجیحات طے کر کے صوبائی اسمبلی کے ذریعہ ان کے بارے میں قانون سازی کا آغاز کر دیجیے کہ اس وقت آپ کے بس میں عملاً صرف یہی ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ جب اپنے بس اور اختیار کا کام آپ کر گزریں گے تو اگلی پیش رفت کی راہیں بھی اللہ تعالیٰ ضرور کھول دیں گے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، فروری ۲۰۰۳)

نفاذ شریعت سے متعلق اقدامات

سرحد حکومت کے اصل کام

سرحد اسمبلی نے گزشتہ دنوں اہم نوعیت کی چند قراردادیں پاس کی ہیں جو اگرچہ سفارشی نوعیت کی ہیں، مگر ان سے سرحد اسمبلی میں متحدہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت کے فکری رجحانات کی نشاندہی ہوتی ہے، اور نفاذ اسلام کے حوالے سے وفاقی حکومت اور ملک کی دیگر صوبائی حکومتوں کے لیے ان میں راہ نمائی کا سامان بھی موجود ہے۔

ایک قرار داد مقاصد میں سرحد اسمبلی نے وفاقی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ پنجاب حکومت کو اس امر کی ہدایت کرے کہ خدائی اور نبوت کی جھوٹے دعویداروں سے سختی سے نمٹا جائے اور ان کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی کی جائے، اس قرارداد کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ باغبانپورہ کالج لاہور کے ایک لیکچرار پروفیسر مشتاق نے کچھ عرصے سے ایک نئے مذہب کا پرچار شروع کر رکھا ہے جس کی رو سے وہ خود ''رب جی'' (نعوذ باللہ) کہلاتا ہے۔ اور اسکے پیروکار ایک دوسرے کو رسول کہتے ہیں، اس شخص نے ملکی کی مختلف دینی اور سیاسی شخصیات کو خطوط لکھے ہیں جن میں انہیں یہ نیا مذہب قبول کرنیکی دعوت دی گئی ہے یہ خط سرحد اسمبلی نے ڈپٹی سپیکر اکرام اللہ شاہد کے نام بھی بھیجا گیا ہے جو انہوں نے اسمبلی میں پیش کر دیا اور صوبائی اسمبلی نے اس پر شدید غصے کا اظہار کرتے ہوئے ایک متفقہ قرارداد کی صورت میں اس نئے مذہب کے بانی کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کیا ہے، اخباری رپورٹوں کے مطابق پروفیسر مذکور کے خلاف علاقہ کی عوام میں شدید غصہ پایا جاتا ہے۔ جب کہ جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو لاہور کے مہتمم ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی نے چند رفقا کے

سمیت علاقے میں جا کر خود صورت حال کی تحقیق کی ہے، اور اس بات کی تصدیق کی ہے کہ پروفیسر مشتاق اور اس کے چیلے اپنے اس نئے مذہب کا مسلسل پرچار کر رہے ہیں، اور لوگوں کو دعوت دے رہے ہیں وہ ان پر ایمان لا کر ''قید'' سے نجات حاصل کریں اور چرس، افیون، شراب، بھنگ اور مکمل جنسی آزادی سے لطف اندوز ہوں، جو ان کے اس نئے مذہب میں بالکل جائز ہیں، اخباری اطلاعات کے مطابق ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی نے ایک وفد کے ہمراہ وزیر اعلیٰ پنجاب چودھری پرویز الٰہی سے ملاقات کر کے انہیں صورت حال سے آگاہ کیا ہے اور ان سے اس نئے مذہب پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا ہے۔

سرحد اسمبلی کی دوسری نشست قرارداد جنوبی وزیرستان پر مبینہ امریکی بمباری کے بارے میں ہے اور اسے پاکستان کی خود مختاری کی سنگین خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے وفاقی حکومت سے کہا گیا ہے یہ ملک کی آزادی، سلامتی اور خود مختاری کا مسئلہ ہے اس پر امریکہ سے شدید احتجاج کیا جائے اور اس روک تھام کے لیے ٹھوس حکمت عملی اختیار کی جائے، اسکے جواب میں امریکی افواج کے اس حالیہ وضاحتی بیان سے صورت حال کی سنگینی میں اور اضافہ ہو گیا ہے کہ ہم اپنی کاروائی جاری رکھیں گے، ہمیں اس میں یہ آزادی حاصل ہے کہ ہم جس جگہ کو منتخب کریں وہاں کاروائی کریں اور یہ پاکستان کی حکومت کی مرضی سے ہوگا، وضاحتی بیان میں یہ کہا گیا ہے کہ افغانستان سے ملحق پاکستانی صوبہ سرحد جس میں امریکا مخالف مسلمان جماعتوں کی حکومت ہے اس نے واقعہ کو زبردستی اچھالا ہے، جو چودہ ماہ قبل افغانستان میں طالبان اور القاعدہ کے خلاف امریکی جنگ کے منافی ہے۔

امریکی افواج کی اس وضاحت سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ امریکہ کو پاکستان کی سلامیت، خود مختاری اور آزادی کی کوئی پرواہ نہیں، اس سلسلہ میں بین الاقوامی قوانین اور اصول وضوابط کی اس کے نزدیک کوئی پرواہ نہیں اور صوبہ سرحد کے عوام کی اکثریت نے امریکی طرز عمل اور اقدامات کے خلاف حالیہ ایکشن میں جس کھلی نفرت کا اظہار کیا ہے وہ اس سے کوئی سبق حاصل کرنے کے لیے تیار نہیں ہے نیز اس وضاحتی بیان کے مندرجات کی رو سے اسے اس ساری صورت حال میں پاکستان کی وفاقی حکومت کی حمایت حاصل ہے۔

سرحد اسمبلی کی ایک قرارداد جمعہ کی چھٹی بحال کروانے کے بارے میں ہے جس میں وفاقی حکومت سے کہا گیا ہے کہ ملک میں حسب سابق جمعہ کی چھٹی بحال کرانے کے لیے اقدامات کیے جائیں ایک قرارداد میں صوبہ سرحد کی اسمبلی نے وفاقی حکومت سے سفارش کی ہے کہ حالیہ افغان لڑائی میں پاکستان کے جتنے مجاہدین امریکا کے خلاف لڑتے ہوئے گرفتار کیے گئے ہیں انہیں جیلوں سے آزاد کیا جائے۔

ایک قرارداد میں سرحد اسمبلی نے وفاقی حکومت سے سفارش کی ہے کہ ملک میں سودی نظام کے خاتمے کے لیے اقدامات کیے جائیں جبکہ ایک قرارداد میں حکومت سے کہا گیا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش کے مطابق شہریوں کے رہائشی مکانات ذاتی گاڑیوں اور ذاتی اسلحہ کو ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

سرحد اسمبلی نے ایک اور قرارداد میں امریکا میں پاکستانی باشندوں پر نئے امیگریشن قوانین کے اطلاق اور ان کے ساتھ ساتھ امریکی حکام کے رویے کی مذمت کی ہے اور وفاقی حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں امریکی حکومت کو سرحد اسمبلی کی تشویش سے آگاہ کرے۔ سرحد اسمبلی کی ان مختلف قراردادوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت اپنے اس منشور کو سامنے رکھے ہوئے ہے جس کی بنیاد پر اس نے الیکشن میں کامیابی حاصل کی ہے اور اسے عوامی مینڈیٹ کا بھی پوری طرح احساس ہے جو اسے ۱۰ اکتوبر کے انتخابات میں عوام کی طرف حاصل ہوا ہے، لیکن یہ بات قابل توجہ ہے کہ کیا صرف ان قراردادوں سے مذکورہ مسائل کے حل کی طرف کوئی پیش رفت ممکن ہوگی۔ ہم پہلے یہ عرض کر چکے ہیں کہ ان قراردادوں سے صرف صوبہ سرحد کی حکومت کے ذہنی رجحانات کی نشاندھی ہوتی ہے، اور ملکی رائے عامہ کی راہنمائی کا سامان فراہم ہوتا ہے لیکن صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت کو اصل عملی میدان اور ہے اور عملی طور پر موثر اقدامات کیے بغیر سرحد حکومت اپنے منشور اور عوامی مینڈیٹ کے تقاضے پورے نہیں کر سکے گی، ہمارے خیال میں متحدہ مجلس عمل کی قیادت اور سرحد میں اس کی صوبائی حکومت کے اصل کرنے کے کام یہ ہیں۔

☆ قومی سطح پر ملکی خودمختاری اور سالمیت کے تقاضوں کو اجاگر کرنے اور مسلسل امریکی مداخلت کا

راستہ روکنے کے لیے منظّم اور مربوط مہم چلائی جائے اور اسے صرف جماعتی جدوجہد تک محدود رکھنے کی بجائے قومی مہم بنانے کی کوشش کی جائے قوم کا ہر طبقہ موجود صورت حال سے ناخوش اور اس کے خاتمے کے لیے کچھ نہ کچھ کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں ہے مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ تمام طبقات کے ساتھ رابطہ قائم کیا جائے اور جماعتی ترجیحات سے بالاتر ہو کر اس مہم کو قومی جدوجہد کی حیثیت دی جائے۔

☆ دستور کی مکمل بحالی اور ایل ایف او کے خاتمے کے لیے بھی جدوجہد کو مربوط اور منظّم بنانے کی سخت ضرورت ہے حکومت نے ایل ایف او سمیت دستور کی نئی کتاب شائع کر کے عملاً یہ کہہ دیا ہے ، وہ ان شخصی ترامیم کو پارلیمنٹ سے منظور کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی ، اس صورت میں منتخب پارلیمنٹ کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ جاتی ، اور دستور کی بحالی کے اعلانات بھی بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں، یہ قومی مسئلہ ہے اور اس کے لیے قومی سطح پر ہمہ گیر جدوجہد وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

☆ سرحد کی صوبائی حکومت نفاذ اسلام کے عمل کے حوالہ سے موجودہ دستوری صورتحال کا جائزہ لے ور '' آئینی ماہرین کے تعاون سے قانون سازی اور نظم اور نسق دونوں شعبوں میں اپنے اختیارات کا واضح طور پر تعین کرے تا کہ موجودہ حالات میں یہ بات اس کے علم میں ہو کہ وہ عملاً کیا کچھ کر سکتی ہے۔

☆ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات میں سے صوبائی اختیارات سے تعلق رکھنے والی سفارشات چھانٹی جائیں اور انہیں سرحد اسمبلی کے ذریعہ قانونی حیثیت دے کر ان پر مرحلہ وار عمل درآمد کا آغاز کر دیا جائے ہم سرحد اسمبلی کی مذکورہ بالا قراردادوں کا خیر مقدم کرتے ہیں اور انہیں ملی حمیت اور قومی غیرت کے اظہار کی علامت قرار دیتے ہوئے متحدہ مجلس عمل کی قیادت اور صوبہ سرحد کی حکومت کے سربراہ جناب محمد اکرم خان درانی سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ قراردادوں کے ذریعے اپنے جذبات کے اظہار کے ساتھ ساتھ اپنے منشور اور عوامی مینڈیٹ کے تقاضے پورے کرنے کے لیے سنجیدہ عملی اقدامات کی طرف بھی توجہ دیں گے۔

(روزنامہ اسلام، ؟؟؟؟)

شریعت بل ...... سرحد حکومت نے کون سا جرم کیا ہے؟

سرحد حکومت کی طرف سے صوبائی اسمبلی میں شریعت بل لانے کی خبر میں نے چند روز قبل بیرون ملک سفر کے دوران پڑھی تو اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ ملک میں ایک نئی کشمکش کا آغاز ہونے والا ہے، کیونکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ایک صوبے میں صوبائی اختیارات کے دائرے میں آنے والے قوانین کو اسلامی شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کی باتیں نہ صرف یہ کہ ملک کے اندرونی مقتدر طبقات کو ہضم نہیں ہوں گی بلکہ بیرونی آقاؤں کے لیے بھی یہ قطعی طور پر ناقابل برداشت ہوں گی۔ چنانچہ سرحد اسمبلی نے تو متفقہ طور پر شریعت بل پاس کر دیا لیکن اس سے وفاق میں جو کھلبلی مچی ہے اس کا اندازہ پے در پے واقع ہونے والے ان واقعات سے کیا جا سکتا ہے۔

☆ سرحد کے چیف سیکرٹری اور آئی جی پولیس کو تبدیل کرنے کا فیصلہ کر دیا گیا ہے کیونکہ موجودہ چیف سیکرٹری اور آئی جی پولیس کے بارے میں تاثر یہ ہے کہ وہ صوبائی حکومت کا ساتھ دے رہے ہیں اور یہ سمجھا جا رہا ہے کہ صوبائی حکومت کو ناکام بنانے کی حکمت عملی میں شاید انہیں پوری طرح استعمال نہیں کیا جا سکے گا۔

☆ صدر جنرل پرویز مشرف نے اس موقع پر وفاقی حکومت کو یہ ہدایت جاری کرنا ضروری خیال کیا ہے کہ روشن خیال اسلامی مملکت کے تصور کو مجروح کرنے والی کوششوں کو ناکام بنایا جائے اور اس کے ساتھ ہی وفاقی شرعی عدالت کے نئے چار ججوں کے تقرر کا اعلان کر دیا گیا ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خاصے ''روشن خیال'' ہیں اور اس طرح وفاقی شرعی عدالت کے دستوری

فورم کو ''روشن خیال اسلام'' کے فروغ کا ذریعہ بنانے کی نئی حکمت عملی کا اندازہ ہوتا ہے۔

☆صوبہ سرحد کے تقریباً تمام اضلاع کے ناظمین نے استعفیٰ دے دیا ہے اور صوبائی حکومت کے خلاف ایک نیا محاذ جنگ کھول دیا ہے جس میں وفاق کی دلچسپی اور حمایت فطری طور پر ناظمین کے کیمپ کے ساتھ ہوگی۔

☆وفاقی وزیر اطلاعات شیخ رشید احمد نے جن الفاظ میں سرحد حکومت کو خبردار کیا ہے وہ سرحد حکومت کے ان اقدامات کے بارے میں وفاق کے عزائم کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سرحد حکومت کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں کہ وہ کس طرف جارہی ہے، اسی لیے انہیں سمجھایا جارہا ہے کہ وہ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کریں کہ خطہ میں موجود حالات کے باعث ان کے اقدامات کے کیا نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔

☆صوبہ سرحد میں پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ایک صوبائی رہنما نے پشاور میں پریس کانفرنس کرکے اعلان کیا ہے کہ وہ صوبائی حکومت کے خلاف صوبہ بھر میں مظاہروں کا اہتمام کررہے ہیں اور شریعت بل کو عدالت میں چیلنج کرنے کا پروگرام بنایا جارہا ہے جس کے لیے انہیں پاکستان مسلم لیگ (ق) کی ہائی کمان کی حمایت حاصل ہے۔

☆وزیر اعظم اس صورت حال پر اس قدر سیخ پا ہیں کہ انہوں نے جہلم میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے متحدہ مجلس عمل کے رہنماؤں سے اس انداز میں مخاطب ہونے سے گریز نہیں کیا کہ ''مسجدوں کا پیسہ کھانے والے ملک کا کیا حشر کریں گے؟

☆دوسری طرف متحدہ مجلس عمل کے رہنما مولانا فضل الرحمٰن نے ضلعی حکومتوں کے نظام پر تنقید کرتے ہوئے صوبہ سرحد کے ضلعی نظماء کے استعفوں کا خیر مقدم کیا ہے اور کہا ہے کہ ناظموں کو اپنے استعفوں پر قائم رہنا چاہیے تاکہ صوبائی حکومت اطمینان کے ساتھ کام کرسکے۔ انہوں نے اعلان کیا ہے کہ اگر صوبہ سرحد کی حکومت کے خلاف کوئی قدم اٹھایا گیا تو اس کے خلاف عوامی احتجاج منظّم کیا جائے گا۔

☆صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ اکرم خان درانی نے صوبائی اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے

کہا ہے کہ شریعت بل پر عمل کیا جائے گا اور جو افسر صوبائی حکومت کی ترجیحات کے مطابق کام نہیں کرے گا اس کے لیے صوبہ میں کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ صوبہ کے چیف ایگزیکٹو کی مرضی کے خلاف چیف سیکرٹری اور آئی جی پولیس کو استعمال کرنا آئین کی خلاف ورزی ہے۔

☆اسی حوالہ سے ایک اور خبر کے مطابق صوبہ سرحد کے چیف سیکرٹری اور آئی جی پولیس کو ان کے عہدوں سے ہٹا کر او ایس ڈی بنا دیا گیا ہے۔

اس معرکہ آرائی کے ساتھ وفاق میں ایل ایف او کے حوالہ سے جاری کشمکش پر ایک نظر ڈال لیں تو صورت حال کا نقشہ قدرے مختلف دکھائی دیتا ہے۔ گزشتہ دنوں متحدہ مجلس عمل کے سیکرٹری جنرل مولانا فضل الرحمٰن نے کوئٹہ میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر حکومت ملک میں (۱) قرآن وسنت کو سپریم لاء قرار دینے کا اعلان کردے۔ (۲) اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو قانونی شکل دینے کی طرف پیش رفت کرے۔ (۳) جمعہ کی چھٹی بحال کردے (۴) بلاسود بینکاری کے لیے اقدامات کرے اور (۵) تعلیمی اداروں کی نجکاری روک دے تو ایل ایف او کے بارے میں متحدہ مجلس عمل اپنے موقف میں لچک پیدا کرسکتی ہے جس پر پاکستان مسلم لیگ (ق) کے سربراہ چوہدری شجاعت حسین کا یہ تبصرہ سامنے آیا کہ وہ متحدہ مجلس عمل کی شرائط ماننے کے لیے تیار ہیں اور ان کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو قانون سازی کی بنیاد بنانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

اس صورت حال میں سرحد کی صوبائی حکومت کے خلاف محاذ آرائی کا بازار گرم کیا جا رہا ہے اور بعض حلقوں کی طرف سے یہ مطالبہ بھی سامنے آ رہا ہے کہ صوبائی حکومت کو برطرف کر کے صوبہ میں گورنر راج نافذ کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ سرحد حکومت نے کونسا ایسا جرم کیا ہے کہ اس کے خلاف یہ سارے عناصر صف آراء ہو گئے ہیں۔ صوبائی اسمبلی نے شریعت بل کے نام سے جو مسودہ قانون منظور کیا ہے وہ ملک کے دستور اور صوبائی حکومت کے دائرہ اختیار کے اندر رہتے ہوئے کیا ہے۔ اس میں کسی غیر متعلقہ بات کو نہیں چھیڑا گیا اور صرف یہ کہا گیا ہے کہ جو معاملات صوبائی حکومت کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں ان سے متعلقہ قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق ڈھالا جائے گا اور ان کی تعبیر

وتشریح کے لیے صوبہ کی تمام عدالتیں قرآن وسنت کی پابند ہوں گی۔ یہ بات تو نہ صرف دستور پاکستان کے مطابق ہے بلکہ خود دستور کے تقاضے کی تکمیل ہے کیونکہ دستور میں قوم کے ساتھ یہ واضح اور دوٹوک وعدہ کیا گیا ہے کہ ملک کے تمام قوانین کو قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھالا جائے گا۔ یہ وعدہ دستوری طور پر قوم سے ۱۹۷۳ء میں کیا گیا تھا اور اس کے لیے سات سال کی مدت بھی متعین کی گئی تھی لیکن تیس سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود وفاق یا ملک کے کسی صوبے نے اپنے اختیارات کے دائرہ میں قوم کے ساتھ کئے گئے اس وعدہ کو پورا کرنے کی طرف توجہ نہیں دی اور اب اگر ایک صوبے نے اس دستوری وعدہ کو پورا کرنے کی طرف پیش رفت کر دی ہے تو وفاق اور اس کے حواری خود شرمندہ ہونے کی بجائے اپنی شرمندگی کو چھپانے کے لیے صوبہ سرحد کی حکومت کے خلاف انتقامی کارروائیوں پر اتر آئے ہیں، بالکل اس عوامی کہاوت کی طرح کہ ناک کٹوں کی ایک بستی میں کوئی ناک والا آ گیا تو سب ناک کٹے اس کے پیچھے پڑ گئے اور اسے ''نکونکو'' کہہ کر بستی سے بھگا دیا ۔اسلامی نظریاتی کونسل بھی ایک دستوری ادارہ ہے جسے دستور پاکستان نے قائم کیا ہے اور اس نے دستور کے تفویض کردہ اختیارات کے تحت ملک کے تمام قوانین کا جائزہ لے کر انہیں اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے جامع سفارشات پیش کر رکھی ہیں۔انہیں قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں میں پیش کر کے ان کے مطابق قانون سازی کرنا تمام وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی آئینی ذمہ داری ہے۔ سرحد حکومت نے اسی دستوری ذمہ داری کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر سرحد حکومت نے نفاذ شریعت کے لیے کوئی غیر جمہوری اور غیر روایتی طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ عوام کے منتخب نمائندوں نے صوبائی اسمبلی کے فورم پر دستوری اختیارات استعمال کرتے ہوئے روایتی جمہوری طریق کار کے مطابق ایک قانونی بل منظور کیا ہے۔اس پر جمہوریت اور دستور کا نام لینے والے کسی شخص کو اعتراض کرنے کا آخر کیا حق ہے؟

محترم شیخ رشید احمد نے حالات کی سنگینی اور خطہ کی صورت حال کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔ان سے گزارش ہے کہ حالات کی یہ سنگینی اور خطہ کی مخدوش صورت حال ہمارے حکمراں طبقوں کے اسی طرز عمل کا نتیجہ ہے کہ وہ گزشتہ نصف صدی سے اسی قسم کے ہتھکنڈوں کے ذریعہ

اسلام کا راستہ روکے ہوئے ہیں اور جب بھی ملک میں نفاذ اسلام کی کوئی سنجیدہ کوشش سامنے آئی ہے مقتدر طبقات اسی طرح اس کے خلاف حرکت میں آجاتے ہیں۔ سیدھی بات ہے کہ اگر جمہوری طریق کار سے اور انتخابی راستے سے اسلام کو آگے آنے کا راستہ نہیں دیں گے اور عوام کے ووٹ اور جذبات کا احترام نہیں کریں گے تو متبادل راستوں کو کون بند کر سکتا ہے؟ افغانستان میں طالبان اسی وجہ سے متبادل راستوں سے آگے آئے تھے اور اگر پاکستان میں بھی عوام کو اسلام کے نفاذ کے لیے متبادل راستہ اختیار کرنا پڑا تو اس کی ذمہ داری ان طبقات پر ہوگی جو صرف امریکہ کو خوش کرنے کے لیے جمہوری راستہ سے آنے والے اسلام کی راہ روک رہے ہیں۔

(روزنامہ اسلام ۷/جون ۲۰۰۳ء)

سرحد اسمبلی کا شریعت بل، حکومتی کیمپ اور محترمہ بینظیر بھٹو

سرحد اسمبلی میں شریعت بل پیش کئے جانے کے ساتھ ہی بلکہ اس سے پہلے ہی اس پر ردعمل کے اظہار کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور اس میں دن بدن شدت آ رہی ہے، ایک طرف وہ عملی اقدامات ہیں جو سرحد حکومت کو ناکام بنانے اور نت نئے مسائل میں الجھانے کے لئے کئے جا رہے ہیں اور ان میں صوبائی حکومت کو اعتماد میں لیے بغیر چیف سیکرٹری اور آئی جی پولیس کے تبادلوں کا فیصلہ اور ضلعی ناظموں کی طرف وفاقی حکومت کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت کے اس اقدام کے خلاف بیان بازی کا سلسلہ جاری ہیں حتیٰ کہ پیپلز پارٹی کی سربراہ محترمہ بےنظیر بھٹو نے بھی اس معاملہ میں حکمرانوں کی ہاں میں ہاں ملانا ضروری سمجھا ہے اور افغانستان پر امریکی حملہ کے بعد یہ دوسرا مسئلہ ہے جس پر حکمران کیمپ اور محترمہ بےنظیر بھٹو یک آواز دکھائی دے رہے ہیں محترمہ بےنظیر بھٹو کو افغانستان میں طالبان حکومت کے خاتمہ کے لیے مسلح امریکی مداخلت پر اعتراض نہیں تھا بلکہ انہیں صرف یہ شکایت تھی کہ یہ کام ان کے ذریعے کیوں نہیں لیا جا رہا اور افغانستان میں روسی جارحیت کے خلاف جہاد کے نتیجے میں ابھرنے والے اسلامی رجحانات کو ختم کرنے کے لیے امریکہ بہادر نے ان کی خدمات پر بھروسہ کرنے کی بجائے جنرل پرویز مشرف کی ٹیم کا انتخاب کیوں کیا ہے؟ اور اب بھی ان کا کہنا ہے کہ صوبہ سرحد کی اسمبلی میں شریعت بل کی منظوری جنرل پرویز مشرف کی پالیسیوں کا نتیجہ ہے ورنہ اگر وہ ان کی جگہ پاکستان میں برسراقتدار ہوتیں تو اس کی نوبت ہی نہ آتی۔

محترمہ بے نظیر بھٹو نے سرحد اسمبلی کے منظور کردہ بل کو ''طالبان بل'' قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ طالبان طرز کے اسلام کو نافذ کرنے کی طرف پیش رفت ہے حالانکہ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ طالبان طرز حکومت اور صوبہ سرحد میں ایم ایم اے کی حکومت کے طرز میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

☆ طالبان افغانستان میں جہادی کمانڈروں کی باہمی کشمکش اور خانہ جنگی کی وجہ سے بذریعہ قوت افغانستان کے اقتدار پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئے تھے جبکہ متحدہ مجلس عمل نے انتخابی عمل کے ذریعہ عوامی ووٹ حاصل کر کے صوبائی حکومت حاصل کی ہے۔

☆ طالبان کا نظام امارت کا نظام تھا جس میں امیر کے شخصی احکامات ہی قانون کا درجہ رکھتے ہیں جبکہ سرحد کی صوبائی حکومت نے منتخب اسمبلی میں بل پیش کر کے عوامی نمائندوں کے ذریعہ اس کا نفاذ کیا۔

☆ طالبان نے افغانستان کے سابقہ نظام کو مکمل طور پر اکھاڑ پھینکا تھا اور اس کی جگہ ایک نیا نظام نافذ کرنے کی طرف پیش رفت کی تھی جب کہ سرحد حکومت نے ملک کے دستور اور مروجہ سسٹم کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس کی طرف سے ملنے والے اختیارات اور حدود میں نفاذ شریعت کے اقدامات کیے ہیں۔

☆ طالبان نے اسلام کے نفاذ اور اس کی تعبیر وتشریح کے لیے اپنے امیر اور اس کی مجلس مشاورت کو فائنل اتھارٹی قرار دیا تھا جب کہ صوبہ سرحد کی حکومت نے اس سلسلہ میں دستور پاکستان کے تحت پہلے سے قائم اداروں اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت کے فیصلوں کو بنیاد بنایا ہے اور انہیں اتھارٹی تسلیم کیا ہے۔

☆ طالبان کا نظام ہمہ گیر اور قومی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط تھا جب کہ سرحد اسمبلی کا منظور کردہ شریعت بل صاف طور پر اعلان کر رہا ہے کہ اس کا تعلق صرف ان معاملات سے ہے جن میں دستور کے تحت صوبائی حکومت کو قانون سازی اور نفاذ قانون کا حق حاصل ہے اس کے علاوہ باقی معاملات سے اسے کوئی سروکار نہیں ہے۔

اس پس منظر میں اس بات پر تو بحث کی گنجائش موجود ہے کہ نفاذ اسلام کے لئے طالبان کا طرز عمل مفید اور موثر تھا یا متحدہ مجلس عمل کا طریق کار زیادہ فائدہ مند ہے مگر سرحد اسمبلی کے منظور کردہ بل کو طالبان بل قرار دینا اور اس کے بارے میں یہ کہنا کہ اس سے طالبان طرز کے اسلام کے نفاذ کی راہ ہموار ہوگی سراسر مغالطہ نوازی اور کج فہمی کی بات ہے جس کی محترمہ بےنظیر بھٹو جیسی ذہین وفطین خاتون اور تجربہ کار سیاستدان سے قطعی طور پر توقع نہیں کی جاسکتی اور اس پر اس کے سوا کسی تبصرہ کی گنجا ئش نہیں ہے کہ محترمہ بےنظیر بھٹو ساری صورتحال کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے بھی جان بوجھ کر سرحد اسمبلی کے شریعت بل کو عالمی حالات کے تناظر میں انتہائی خوفناک شکل میں پیش کر کے اعلیٰ ترین قوتوں کو یقین دلانا چاہ رہی ہیں کہ اگر انہیں یعنی محترمہ بےنظیر بھٹو کو اسی طرح نظر انداز کیا جاتا رہے گا تو حالات اسی رخ پر آگے بڑھتے رہیں گے۔

دوسری طرف حکمران کیمپ کی صورتحال یہ ہے کہ سرحد اسمبلی میں شریعت بل کی منظوری پر اس کی بےچینی اور اضطراب قابل دید ہے، صدر پرویز مشرف نے اس پر اپنے ردعمل کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ وفاقی حکومت کو چاہیے کہ وہ پاکستان کو ایک روشن خیال اسلامی ریاست بنانے کے تصور کو مجروح کرنے کی کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دے، وزیراعظم میر ظفر اللہ خان جمالی نے جہلم میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے یہ کہہ کر اپنے غصے کا اظہار کیا ہے کہ مسجدوں کے پیسے کھانے والے ملک کا کیا حشر کریں گے؟ حکمران مسلم لیگ کے سربراہ چوہدری شجاعت حسین نے فرمایا ہے۔ سرحد اسمبلی میں شریعت بل پیش کرنے کی سرے سے کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ جب اسلامی نظریا تی کونسل قائم ہے اور وفاقی شرعی عدالت موجود ہے تو اس کے بعد نطاذ اسلام کے لئے اور کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی حالانکہ یہ بات چودھری صاحب موصوف کے علم میں یقیناً ہوگی کہ صوبہ سرحد کی اسمبلی نے اسی اسلامی نظریاتی کونسل کے فیصلوں اور سفارشات کو صوبائی اختیارات کی حدود میں نافذ کرنے کی بات ہے جس کا ذکر انہوں نے فرمایا ہے اور جسے وہ خود بھی نفاذ اسلام کی علامت قرار دے رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل توجہ ارشادات وفاقی وزیر اطلاعات جناب شیخ رشید احمد

کے ہیں جنہوں نے متحدہ مجلس عمل کے خلاف گولہ باری کے محاذ کی کمان سنبھال رکھی ہے اور وہ بھی محترمہ بےنظیر بھٹو ہی کے لہجے میں سرحد کی صوبائی حکومت کے لئے لئے جارہے ہیں، شیخ رشید احمد نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز اسلام کے نعرہ سے کیا تھا، شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خانؒ کی سرپرستی میں سیاسی پیش قدمی کی راہ ہموار کی تھی اور راجہ بازار راولپنڈی خصوصاً دارالعلوم تعلیم القرآن میں اسلام کے حق میں شیخ رشید احمد کے پرجوش خطابات کی گونج آج بھی پرانے سیاسی کارکنوں کے کانوں میں سنائی دے رہی ہے مگر اب وہ وزارت اطلاعات کے منصب پر فائز ہونے کے بعد فرمارہے ہیں کے اسلام کو اسلام آباد سے دور رکھو، ان کا ارشاد ہے کہ وہ اسلام کے لیے وہ متحدہ مجلس عمل کے ساتھ ہیں لیکن متحدہ مجلس عمل اسلام آباد کے لیے فٹ نہیں ہے اس لیے اسے اسلام آباد سے دور رہنا چاہیئے اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ وہ اسلام اور اسلام آباد کے درمیان فاصلہ قائم رکھنا چاہتے ہیں، وہی فاصلہ جو محترمہ بےنظیر بھٹو کے نزدیک اسلام اور اسلام آباد کے درمیان قائم رہنا ضروری ہے اور وہی فاصلہ جسے آج کے عالمی حکمرانوں نے نہ صرف اسلام اور اسلام آباد کے درمیان بلکہ دنیا کے ہر مسلمان ملک کے دارالحکومت اور اسلام کے درمیان ضروری قرار دے رکھا ہے اور انہی عالمی حکمرانوں کی خوشنودی کی خاطر عالم اسلام کے اکثر و بیشتر حکمرانوں اور سیاستدانوں نے اسلام کے سیاسی اور حکومتی کردار کی نفی کو اپنا فریضہ قرار دیا ہے۔

شیخ رشید احمد نے فرمایا ہے کہ متحدہ مجلس عمل کو عالمی حالات اور خطہ کی صورتحال کی سنگینی کا احساس کرنا چاہیے ان کی خدمت میں مودبانہ گزارش ہے کہ اگر ملک کے مقتدر طبقات اسلام کا راستہ اسطرح روکتے رہیں گے تو حالات کی سنگینی میں کمی کے بجائے اضافہ ہوگا، یہ ملک اسلام کی خاطر بنا ہے، ملک کے عوام ایک سے زیادہ بار اسلامی نظام کے بارہ میں فیصلہ دے چکے ہیں، متحدہ مجلس عمل نے گزشتہ الیکشن میں نفاذ اسلام کے وعدہ پر ووٹ لیے ہیں اور عوامی مینڈیٹ کا احترام اس کی ذمہ داری ہے دستور پاکستان نے ملک کے تمام قوانین کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی گارنٹی دے رکھی ہے، اسلامی نظریاتی کونسل نے دستور کے تفویض کردہ اختیارات کے تحت مروجہ قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق بنانے کے لیے سفارشات مرتب کی ہیں اور سرحد اسمبلی نے انہی سفارشات صوبائی

اختیارات کے دائرہ میں عمل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اگر شیخ رشید اور ان کا کیمپ عالمی حالات اور خطہ کی صورتحال یا دوسرے الفاظ میں امریکہ اور بھارت کی خوشنودی کی خاطر مذکورہ بالا تمام حقائق کو کراس کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو یہ فیصلہ انہیں مبارک ہو لیکن ایک بات انہیں ہر وقت یاد رکھنی چاہیے پاکستان کے عوام کو اسلام سے دست بردار کرانے کی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوگی اور اگر جمہوری اور سیاسی عمل کے ذریعے نفاذ اسلام کا راستہ روکنے کی کوششیں اسی طرح جاری رہیں تو اس کے ردعمل میں خطہ کی صورت حال جو رخ اختیار کرے گی اس کا سامنا کرنا شیخ محترم اور ان کے کیمپ کے بس کی بات نہیں ہوگی۔

(روزنامہ اوصاف، ۱۱رجون ۲۰۰۳)

سرحد میں شرعی قوانین کے نفاذ میں درپیش مشکلات

صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت نے اسلامی اصلاحات کے عمل کا آغاز کر دیا ہے اور صوبائی وزیراعلیٰ محمد اکرم خان درانی نے گزشتہ روز صوبائی کابینہ کے طویل اجلاس کے بعد پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بتایا ہے کہ مولانا مفتی غلام الرحمان کی سربراہی میں جو نفاذ شریعت کونسل صوبہ میں نفاذ اسلام کے سلسلہ میں سفارشات اور تجاویز مرتب کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی اس نے اپنی رپورٹ پیش کر دی ہے اور اس رپورٹ میں روشنی میں سرحد اسمبلی میں شریعت ایکٹ لایا جا رہا ہے جس میں صوبائی دائرہ اختیار کی حدود میں تمام اسلامی قوانین اور اقدامات کو شامل کیا جائے گا۔ نفاذ شریعت کونسل کی سفارشات کا گزشتہ کئی دنوں سے اخبارات میں تذکرہ ہو رہا ہے اور جناب اکرم خان درانی نے پریس کانفرنس میں اس سلسلہ میں کونسل کی جن تجاویز کا ذکر کیا ہے ان میں درج ذیل امور بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

☆ صوبہ میں قائم عدالتیں صوبائی دائرہ اختیار میں آنے والے قوانین کی تشریح و تعبیر شریعت کے مطابق کرنے کی پابند ہوں گی۔

☆ احتساب کے لیے ادارہ قائم کیا جائے گا جس کے تحت صوبائی و ضلعی سطح پر محتسب مقرر ہوں گے۔

☆ صوبہ میں نظام صلوٰۃ قائم ہوگا۔

☆ میٹرک تک تعلیم مفت ہونے کے علاوہ مڈل تک تعلیم لازمی ہوگی۔

☆ خواتین کے لیے علیحدہ یونیورسٹی اور میڈیکل کالج قائم کیا جائے گا۔

☆ میٹرک کی سطح پر آرٹس اور سائنس کے ساتھ اسلامیات (درس نظامی) کا گروپ بھی قائم کیا جائے گا۔

☆ مرکزی حکومت سے ادویات پر ٹیکس ختم کرنے کی سفارش کی جائے گی۔

☆ غیرت کے نام پر قتل، خواتین کو میراث سے محروم رکھنے اور یکبارگی تین طلاقیں قابل تعزیر جرم ہوں گی۔

☆ خواتین کی ماڈلنگ اور فحش و عریاں تصاویر پر مکمل پابندی ہو گی۔

☆ اقلیتوں کے حقوق کا مکمل تحفظ اور ان کو پوری مذہبی آزادی دی جائے گی۔

یہ ان اقدامات کی ایک سرسری فہرست ہے جو صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت نے اسلامائزیشن کے حوالہ سے تجویز کئے ہیں اور چند روز تک اس کی کوئی نہ کوئی عملی شکل سامنے آجائے گی۔

صوبہ سرحد اس سے قبل دو مرتبہ اسی نوعیت کی اصلاحات کے عمل سے گزر چکا ہے ایک بار ۱۸۳۰ء میں جب خانوادہ ولی اللٰہی کے مجاہدین نے حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ اسماعیل شہید کی قیادت میں سکھوں کے ساتھ جہاد کے ذریعہ پشاور کی حکومت پر قبضہ کیا تھا اور اس خطہ میں نفاذ شریعت کے آغاز کے ساتھ ساتھ اسے جنوبی ایشیا میں برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف جنگ آزادی کا بیس کیمپ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن انہیں اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تھی اور وہ صرف چھ ماہ حکومت کرنے کے بعد ۹ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں جام شہادت نوش کر گئے تھے۔ امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہید کو نفاذ اسلام کے اقدامات کے حوالہ سے اس خطہ میں بعض طبقات کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ جناب اکرم خان درانی اور ان کے رفقاء کی ٹیم کو اپنی ذاتی معلومات کے لیے شہدائے بالاکوٹ کی پشاور پر حکومت اور پھر اس کی ناکامی پر ضروری لٹریچر کا مطالعہ کرنا چاہئے اور اس تجربہ کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے استفادہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ خطہ وہی ہے عوام کا مزاج اور نفسیات وہی ہیں اور ایجنڈا بھی وہی ہے۔ اس لئے سابقہ تجربہ کا مطالعہ

کرنا اور اچھی طرح سے اس کی اسٹڈی کر کے نئے تجربہ کی تیاری کرنا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ عرض کرنے میں بھی کوئی باک نہیں ہے کہ پشاور کے پڑوس میں کابل اور افغانستان میں ماضی قریب میں طالبان کی اسلامی حکومت کی کامیابی اور ناکامی کے عوامل ونتائج کو جانچنا بھی اس نئے تجربے کا ناگزیر تقاضا ہے۔ یہ درست ہے کہ طالبان حکومت کی ناکامی کے زیادہ تر عوامل خارجی ہیں لیکن یہ کہہ کر ہم ان داخلی عوامل کی نفی نہیں کر سکتے جن کی وجہ سے خارجی عوامل کو آگے بڑھنے اور منفی کردار ادا کرنے کا موقع مل گیا تھا اور عقل ودانش کا تقاضا ہے کہ امارات اسلامی افغانستان کے المناک سقوط کے کے داخلی اور خارجی دونوں طرح کے اسباب وعوامل کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور کسی بھی نئے تجربے میں ان سے سبق اور رہنمائی حاصل کی جائے۔ پشاور میں اسلامی اصلاحات کا دوسرا مرحلہ اس وقت آیا تھا جب حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے صوبہ سرحد میں جمعیۃ علمائے اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی کی کولیشن سے قائم ہونے والی صوبائی حکومت میں وزیراعلیٰ کا منصب سنبھالا تھا اور شراب پر پابندی کے اعلان کے ساتھ حکومت کا آغاز کیا تھا۔ حضرت مفتی صاحب کو تقریباً بیس ماہ تک حکومت کرنے کا موقع ملا تھا اور اس کے بعد صوبہ بلوچستان میں جمعیت اور نیپ کی کولیشن حکومت کے وزیراعلیٰ سردار عطاء اللہ خان مینگل کی برطرفی پر احتجاج کرتے ہوئے انہوں نے وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

اس دس ماہ کے دوران اگرچہ مفتی صاحبؒ چند اقدامات ہی کر سکے تھے اور باقی اصلاحات کے لیے تیاریاں جاری تھیں کہ حکومت ختم ہوگئی لیکن ان چند اقدامات مثلاً شراب پر مکمل پابندی ،اردو کو سرکاری زبان قرار دینا، سکولوں میں قرآن کریم کی تعلیم لازمی قرار دینے اور تقاوی قرضوں پر سود کی معافی جیسے اقدامات کے حوالہ سے انہیں بیوروکریسی اور دیگر حلقوں کی طرف سے جن رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا ان کا جائزہ لینا اور نئے تجربہ کے موقع پر انہیں سامنے رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ اصل مسئلہ اقدامات واصلاحات کا نہیں بلکہ ان پر عمل درآمد کا نہیں اور ہمارے ہاں سول سروس کا جو نظام فرنگی استعمار سے ہمیں ورثہ میں ملا ہے اس کی موجودگی میں کسی اچھے سے اچھے اقدام کی کامیابی کے امکانات بھی مخدوش ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں بیوروکریسی سے ہی ایک شہادت پیش کرنا چاہوں

گا۔جن دنوں مولانا سمیع الحق اور مولانا قاضی عبداللطیف کی طرف سے سینٹ میں پیش کردہ شریعت بل زیر بحث تھا اور پورے ملک میں جدوجہد ہورہی تھی گوجرانوالہ ڈویژن کے کمشنر غلام مرتضیٰ پراچہ نے جو ایک پرانے اور تجربہ کار بیوروکریٹ تھے مجھ سے ایک ملاقات میں پوچھا کہ یہاں آپ حضرات کیا کررہے ہیں؟ میں نے بتایا کہ شریعت بل کے بارے میں جدوجہد کررہے ہیں۔ یہ بل تسلیم ہوگا اور قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لاء تسلیم کیا جائے گا تو ملک میں تمام قوانین کی اسلام کے مطابق تعبیر وتشریح ضروری ہوجائے گی اور بتدریج ملک کا نظام اسلامی ہوجائے گا۔ یہ سن کر پراچہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا مولوی صاحب! آپ بڑے بھولے ہیں آپ ملک میں شریعت نافذ کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھ رہے کہ یہ کام آپ کون سی مشینری کے ذریعہ کرنا چاہ رہے ہیں؟ ارے بھائی عمل درآمد تو ہم لوگوں نے کرانا ہے یہاں تو ہم بیٹھے ہیں آپ اگر خود بھی اقتدار میں آجائیں تو آپ کے احکامات کا نفاذ تو ہمارے ذریعہ سے ہونا ہے۔ اگر آپ ہم سے اس سلسلہ میں کوئی توقع رکھتے ہیں تو یہ آپ کی خوش فہمی ہے پہلے ہماری جگہ اپنا آدمی بٹھانے کی کوئی صورت نکالیں اس کے بعد اسلام کے نفاذ کی بات کریں۔ یہ بات سوفیصد درست نہ بھی ہو تو سوفیصد غلط بھی نہیں ہے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ انتظامیہ اور عدلیہ کی موجودہ مشینری تعلیم وتربیت کے جن مراحل سے گزر کر آئی ہے ان کے پیش نظر اگر وہ خود چاہے تو بھی شاید نفاذ اسلام کے عملی اقدامات اس کے لیے آسان نہیں ہونگے۔ ان گزارشات کا مطلب یہ نہیں کہ صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت کے مجوزہ اور مذکورہ اقدامات سے اختلاف کررہے ہیں۔ نہیں اور ہرگز نہیں بلکہ یہ ہماری خواہشات اور جذبات کا آئینہ دار ہیں اور صوبہ سرحد کے عوام کی دیرینہ خواہش کی عکاسی کرتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک اصلاحات کی طرف قدم بڑھانے کے ساتھ ساتھ ان خفیہ اور علانیہ رکاوٹوں کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ نیز اس سے قبل اس سلسلہ میں ہونے والے تجربات کی ناکامی کے اسباب کا مطالعہ بھی لازمی ہے کیونکہ ان رکاوٹوں اور اسباب کو کم سے کم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے انہیں پس پردہ رکھنے کی بجائے بے نقاب کرکے اس سلسلہ میں عوام کو اعتماد میں لینا بھی اسلامائزیشن کی جدوجہد کا ناگزیر تقاضہ ہے۔

ان معروضات کے ساتھ جناب محمد اکرم خان درانی اوران کے رفقاء کواس اہم پیش رفت پر مبارکباد دیتے ہیں اوران کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت اس مشن میں انہیں مکمل کامیابی سے نوازیں، راستہ کی رکاوٹیں عبور کرنے کی ہمت عطا فرمائیں اوران کی اس کاوش کو پورے پاکستان بلکہ دیگر مسلم ممالک کے لیے بھی ایک لائق تقلید نمونہ بنادیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام ۳۰/مارچ ۲۰۰۳ء)

قومی خودمختاری کی بحالی۔ ہمارااصل مسئلہ!

''آن لائن'' کی رپورٹ کے مطابق گورنر سرحد سید افتخار حسین شاہ نے سرحد اسمبلی کے منظور کردہ ''حسبہ ایکٹ'' کو آئین سے متصادم قرار دیتے ہوئے واپس کردیا ہے۔خبر میں بتایا گیا ہے کہ گورنر کی طرف سے ''حسبہ ایکٹ'' پر سات اعتراضات کئے گئے ہیں جن میں آئین سے تجاوز اور عدالتوں کو نظرانداز کرنے کے دو اعتراض بھی شامل ہیں جبکہ صوبائی وزارت قانون نے چھ صفحات پر مشتمل جواب میں ان اعتراضات کو غلط فہمی پر مبنی قرار دیا ہے۔جواب میں کہا گیا ہے کہ ''حسبہ ایکٹ'' ممتاز آئینی اور قانونی ماہرین کی مشاورت سے بنایا گیا ہے اور اس میں جو طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے اس کی آئین میں گنجائش موجود ہے،اس سے قبل خبر آئی تھی کہ گورنر سرحد نے ۷رجون کو منظور کردہ سرحد اسمبلی کے ''شریعت ایکٹ'' پر دستخط نہیں کئے۔

ہمیں پہلے سے اندازہ تھا کہ سرحد اسمبلی ''شریعت ایکٹ'' اور ''حسبہ ایکٹ'' کے نام سے جو کچھ کرنے جارہی ہے اگرچہ اس میں آئینی حدود کی پاسداری کی مکمل ضمانت دی گئی ہے،صوبائی اختیارات کی دستوری حدود میں رہنے کا اعلان کیا گیا ہے،سرحد اسمبلی نے متفقہ طور پر اس کی منظوری دی ہے اور صوبہ سرحد کے عوام نے موجودہ سرحد اسمبلی کو اسی بات کا مینڈیٹ دیا ہے لیکن اس سب کچھ کے باوجود یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی اور ملک کی اصل حکمران ''اسٹیبلشمنٹ'' کے لیے یہ بات کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہوگی کہ ملک کے کسی حصے میں شرعی قوانین اور احکام کے نفاذ کی طرف اس طرز کی کوئی پیش رفت ہو جس سے موجودہ سسٹم اور نظام کے کسی بھی حصے کے متاثر

ہونے کا کوئی امکان نظر آتا ہو اس لیے گورنر سرحد کے یہ اعتراضات اور اسمبلی کے منظور کردہ ایکٹ پر دستخط کرنے سے ان کا گریز ہمارے لیے قطعاً غیر متوقع نہیں ہے۔اس سے قبل حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے دور حکومت میں بھی اس قسم کی صورتحال کا سامنا کر چکے ہیں، مجھے یاد نہیں کہ یہ داستان میں نے اس سے پہلے قارئین کی خدمت میں کسی موقع پر پیش کی ہے یا نہیں البتہ موقع کی مناسبت سے اب اس کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں، یہ ۱۹۷۲ء کی بات ہے مشرقی پاکستان الگ ہو کر بنگلہ دیش بن چکا تھا، باقی ماندہ پاکستان پر جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب مرحوم ملک کے صدر کی حیثیت سے کاروبارحکومت چلا رہے تھے،صوبہ سرحد میں نیپ اور جمعیۃ کی کولیشن کو اکثریت حاصل تھی اور مولانا مفتی محمودؒ کو صوبہ کا وزیر اعلیٰ منتخب کیا گیا تھا، ارباب سکندر خان خلیل مرحوم صوبہ سرحد کے گورنر تھے اور دونوں درویش صفت سیاستدانوں کا جوڑ صوبائی منظر پر عجیب سی بہار رکھا رہا تھا، مفتی صاحب نے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے حلف اٹھایا اور سب سے پہلا اعلان یہ کیا کہ صوبہ سرحد میں شراب بنانے، بیچنے اور پینے پلانے پر پابندی ہوگی اور یہ قابل دست اندازی پولیس جرم ہوگا، مولانا مفتی محمودؒ نے شراب پر مکمل پابندی کا اعلان کے ساتھ صوبہ سرحد میں اپنی حکومتی ذمہ داریوں کا آغاز کیا اور اس کے ساتھ اردو کو سرکاری زبان قرار دینے، تقاوی قرضوں پر سود کی معافی اور اسکولوں میں دینیات کے استاد مقرر کرنے سمیت متعدد دیگر اصلاحات بھی کیں مگر شراب پر پابندی کا اعلان ملک بھر میں موضوع بحث بن گیا، جدید حلقوں میں اسے ''دقیانوسیت'' سے تعبیر کیا گیا۔ترقی اور تہذیب کے منافی قرار دیا گیا اور ماضی کی طرف واپس جانے کے طعنے دیئے گئے، بعض زیادہ منچلوں نے اسے طنز و تشنیع اور تمسخر و استہزاء کا نشانہ بھی بنایا اور مختلف محافل میں شراب کی بوتلوں کو ''چھوٹا مفتی'' اور ''بڑا مفتی'' کا نام دے کر اسلام مخالف عناصر نے دل کی بھڑاس نکالنے کا راستہ اختیار کیا لیکن اس سلسلہ میں سب سے دلچسپ بات وہ خط و کتابت تھی جو وفاق نے اس مسئلہ پر صوبائی حکومت کے ساتھ کی اور جس کی تفصیل حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے خود ایک موقع پر جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں ہمیں سنائی۔

مفتی صاحب نے بتایا کہ صوبہ سرحد میں شراب پر پابندی کے اعلان کے بعد وفاق کی طرف

سے صوبائی حکومت کو پہلا خط یہ موصول ہوا کہ شراب پر پابندی کے بعد اس مد سے صوبائی حکومت کو ٹیکس کی جو آمدنی ہوتی تھی وہ موقوف ہو جائے گی اور صوبائی بجٹ میں اس سے خسارہ ہوگا۔ صوبہ اس خسارہ کو پورا کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرے گا؟ کیونکہ مرکز اس سلسلہ میں صوبے کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا صوبائی حکومت نے جواب دیا کہ ہم اپنے اخراجات میں کمی کر کے اس خسارے سے نمٹ لیں گے اور وفاق کو اس سلسلہ میں زحمت نہیں دیں گے۔ اس کے بعد دوسرا خط وفاق کی طرف سے یہ آیا کہ صوبے میں غیر مسلم بھی رہتے ہیں جو شراب کو حرام نہیں سمجھتے، انہیں شراب مہیا کرنے کے لیے صوبائی حکومت کیا اقدامات کر رہی ہے؟ اس کا جواب مفتی صاحب کی حکومت نے یہ دیا کہ جو غیر مسلم شراب کو حرام نہیں سمجھتے ان پر شراب کی پابندی کا اطلاق نہیں ہوگا لیکن انہیں شراب مہیا کرنا اور اس کا اہتمام کرنا حکومت کی ذمہ داری نہیں ہے اس لیے ہم اس سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد تیسرا خط آ گیا کہ شراب بعض بیماریوں کا علاج ہے، اس لیے بیماروں کے علاج کے لیے ہسپتالوں میں شراب مہیا کرنے کا اہتمام ضروری ہے۔ صوبائی حکومت نے اس کے جواب میں صوبائی ہیلتھ سیکرٹری کی سربراہی میں ممتاز ڈاکٹر صاحبان پر مشتمل میڈیکل بورڈ بنا دیا اور اس کے ذمے یہ بات لگائی کہ ایسی بیماری کی نشاندہی کی جائے جو جان لیوا اور شراب کے علاوہ اس کا کوئی متبادل علاج نہ ہو۔ مفتی صاحب کا کہنا تھا کہ اگر میڈیکل بورڈ کسی ایسی بیماری کی نشاندہی کر دیتا تو ہم اس کے لیے شرعی اصولوں کی روشنی میں شراب مہیا کرنے کی کوئی صورت ضرور نکالتے لیکن میڈیکل بورڈ کی رپورٹ یہ تھی کہ ایسی کوئی بیماری دنیا میں نہیں ہے جو جان لیوا ہو اور اس کا شراب کے علاوہ کوئی اور متبادل علاج نہ ہو۔

شراب کے مسئلہ پر وفاق اور صوبے کی یہ ''کاغذی جنگ'' ابھی اس مرحلہ تک پہنچی تھی کہ بھٹو صاحب مرحوم نے بلوچستان میں نیپ اور جمعیت کی مشترکہ حکومت کو جو سردار عطاء اللہ مینگل کی سربراہی میں کام کر رہی تھی، اچانک برطرف کر دیا جس پر احتجاج کرتے ہوئے سرحد کے گورنر ارباب سکندر خان خلیل مرحوم اور وزیر اعلیٰ مفتی محمودؒ نے استعفیٰ دے دیا اور اس طرح تقریباً دس ماہ تک کام کرنے کے بعد سرحد اور بلوچستان دونوں صوبوں میں نیپ اور جمعیۃ کی مشترکہ حکومتیں ختم

ہو گئیں۔

یہ اس دور کی بات ہے جب پاکستان کے معاملات میں بیرونی مداخلت اگرچہ موجود تھی لیکن اس قدر ہمہ گیر اور اعلانیہ نہیں تھی اور ہمارے حکمران طبقات اپنے ''خفیہ سرپرستوں'' کی ناراضگی سے بچنے کے لیے کسی بھی ایسے اقدام میں روڑے اٹکانا اپنی ذمہ داری سمجھا کرتے تھے جس سے کسی اسلامی قانون پر عملدرآمد کی کوئی صورت دکھائی دیتی ہو، اب تو صورتحال ہی مختلف ہے کیونکہ اب امریکہ کی قیادت میں ''ورلڈ اسٹیبلشمنٹ'' کھلم کھلا ہمارے معاملات کو کنٹرول کر رہی ہے اور اس کے اہداف میں سرفہرست یہ بات ہے کہ پاکستان کو ایک عملی اسلامی ریاست بننے سے روکا جائے اس لیے ان حالات میں ملک کی داخلی اسٹیبلشمنٹ سے یہ توقع رکھنا ہی عبث ہے کہ وہ نفاذ اسلام کی طرف کسی معمولی سی پیش رفت میں تعاون کرے یا کم از کم اسے برداشت ہی کر لے گی۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم نفاذ شریعت کے اقدامات کے حق میں نہیں ہیں، یہ تو ہمارے فرائض میں سے ہے اور جس شخص یا جماعت کو جس سطح پر اور جس درجے میں بھی اس کا کوئی موقع ملتا ہے اسے ضائع کرنا ہمارے نزدیک شرعی طور پر کوتاہی اور جرم متصور ہوتا ہے البتہ ایسے کسی اقدام کے نتیجہ خیز ہونے کی توقع رکھنا اور یہ سمجھ لینا کہ مروجہ سسٹم کے ہوتے ہوئے ہم اس ملک میں نفاذ اسلام کی طرف کوئی عملی پیش رفت کر سکیں گے خود فریبی کی بات ہوگی۔ ہمارا اصل مسئلہ قومی خودمختاری کی بحالی کا ہے اور یہ حق حاصل کرنے کا ہے کہ ہم اپنے فیصلے خود کر سکیں اور ہمیں اپنے ملک کے لیے کوئی نظام پسند کرنے یا قومی زندگی کے طور طریقے طے کرنے کے حوالے سے طاقت کے زور پر ڈکٹیشن نہ دی جائے کیونکہ جب تک ہم اپنے فیصلے خود کرنے اور اپنے معاملات خود طے کرنے کا حق بحال نہیں کرا لیتے تب تک پاکستان میں نفاذ اسلام یا نظام میں اصلاح کے کسی بھی عمل کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

(روزنامہ اسلام، ۲۳ رجولائی ۲۰۰۳)

طالبائزیشن اورامریکنائزیشن!

سرحد اسمبلی نے دوران بحث کے بعد ’’حسبہ بل‘‘ چونتیس کے مقابلے میں اڑسٹھ کی اکثریت سے منظور کر دیا ہے، جب کہ وفاقی حکومت نے اسے دستور میں بنیادی حقوق کے بارے میں دی گئی ضمانت کے منافی قرار دیتے ہوئے سپریم کورٹ میں جانے کا اعلان کر دیا ہے، اے پی پی کے مطابق وفاقی وزیر قانون جناب وصی ظفر نے کہا ہے کہ حسبہ بل میں انارکی پھیلانے اور جمہوریت کو ناکام بنانے کا ذریعہ بنا ہے، جسے موجودہ جمہوری حکومت ہرگز کامیاب نہیں ہونے دے گی، اس کے ساتھ ہی اخباری اطلاعات کے مطابق وفاقی حکومت نے اٹارنی جنرل مخدوم علی خان کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ دستور کی دفعہ ۱۸۶ کے مطابق سپریم کورٹ میں اس استفسار کے لیے ریفرنس دائر کرنے کی تیاری کریں کہ کیا سرحد اسمبلی کا منظور کردہ یہ حسبہ بل دستور میں بنیادی حقوق میں دی گئی ضمانت کے منافی تو نہیں ہے؟

حسبہ بل کے حوالے سے بحث ایک عرصہ سے جاری تھی اوراس کے بارے میں حمایت اورمخالفت پر مشتمل تندوتیز بیانات کا سلسلہ چل رہا تھا، اب اس کشمکش نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا ہے ،اور بحث کا میدان سپریم کورٹ میں لگے گا، جہاں دونوں طرف کے وکلاء اوردانش ور بنیادی حقوق کی دستوری دفعات اورحسبہ بل کی جزئیات کی چھان بین کریں گے، یوں بحث ومباحثے کا نیا بازارگرم لگے گا۔قیام پاکستان کے بعد سے ابتک سپریم کورٹ نے اسلامائزیشن کے مختلف اقدامات کے حوالے سے جوحتمی فیصلے دیے ہیں انکا ریکارڈ سامنے رکھتے ہوئے سرحد اسمبلی کے

منظور کردہ حسبہ بل کے بارے میں بھی یہ توقع کرنا مشکل ہے کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ ماضی کی روایات سے ہٹ کر ہوگا، اس لیے نظر یہی آتا ہے کہ قرارداد مقاصد کے دستوری بالادستی اور سودی قوانین کے خاتمے کیطرح حسبہ بل بھی دستوری آنکھ مچولی کے بعد پاکستان کے ''دستوری عجائب گھر کی نذر ہوجائے گا، اور کاروبار زندگی حسب سابق اسی طرح معمول کے مطابق چلتا رہے گا، جیسے گزشتہ پچپن برس یا اس سے ڈیڑھ دو سو برس پہلے چلتا آرہا ہے۔

کہا جاتا ہے کی صوبہ سرحد میں ایم ایم اے کی حکومت اس بل کے ذریعے اپنا ووٹ بینک محفوظ کرنا چاہتی ہے اور وفاقی حکومت پر جوش مخالفت کر کے اپنی ''بیک'' مضبوط کرنے کی فکر میں ہے۔ اس لیے ہمارے بعض دانش ور دوستوں کے نزدیک یہ محض ایک انتخابی شعبدہ بازی ہے اور ان کے خیال میں کسی کو اس کے بارے میں زیادہ فکر مند ہونے نہیں چاہیے، البتہ ہمارے نزدیک یہ بات قابل اطمینان ہے کہ دونوں ٹیموں نے دستوری دائرے میں رہتے ہوئے کھیل کے قواعد وضوابط کو ملحوظ رکھا ہے، سرحد حکومت نے اپنی اننگز صوبائی اسمبلی کی پچ پر کھیلی ہے جو اس کا جائز حق تھا اور وفاقی حکومت اپنی اننگز سپریم کورٹ میں کھیلنے جارہی ہے جو اس کا جائز حق ہے باقی اللہ اللہ خیر صلا۔

جہاں تک ''اسلامائزیشن'' کا تعلق ہے اسکے بارے میں اصل صورت حال وہی ہے جو مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے بتائی تھی، دارالعلوم کے ترجمان ماہنامہ ''البلاغ'' کے مفتی اعظم نمبر کے مطابق جس دور میں حضرت مفتی صاحبؒ حکومت کے قائم کردہ ''تعلیمات اسلامیہ بورڈ'' کے ممبر تھے اور اس بورڈ کی ذمہ داری یہ تھی، کہ وہ ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کیلیے کام کرے اور سفارشات مرتب کر کے حکومت کو پیش کرے اس دوران مفتی صاحب مرحوم نے بورڈ کے سربراہ کو جو غالباً سپریم کورٹ کے جج تھے، کسی مسئلے پر بحث کے موقع یہ کہا کہ ''قانون سازی کے کام کو اسلام کے رخ پر آپ نہیں چلنے دیتے اور غلط پر میں نہیں چلنے دوں گا۔ نتیجہ یہ ہوگا یہ گاڑی کھڑی رہے گی۔ چنانچہ گاڑی کھڑی رہی، یہ گاڑی اب تک کھڑی ہے، اس کے دونوں طرف طاقت ور انجن لگے ہوئے ہیں، دونوں میں سے کوئی انجن کسی وقت سٹارٹ ہو کر گاڑی کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتا ہے، تو دوسری طرف انجن بھی سٹارٹ ہوجاتا ہے اور اپنی طرف زور لگا کر گاڑی کا جام

کر دیتا ہے،

یہ تنازع دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے علمائے کرام اور درسگاہوں کے تربیت یافتہ قانونی ماہرین اور ارباب سیاست کے درمیان ہے،اوراس کشمکش سے دو بنیادی نکتے ہیں،جن میں کسی ایک نکتے پر بھی کوئی فریق لچک دکھانے کیلیے تیارنہیں ہے۔ایک نکتہ اختلاف یہ ہے کہ علمائے کرام کا موقف یہ ہے کہ چونکہ جدید قانون کے ماہرین قرآن وسنت کی تعلیمات سے کماحقہ بہرہ ورنہیں ہیں اس لیے انہیں قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح میں علمائے کرام کی بات کوحتمی سمجھنا ہوگا ۔دوسری طرف عصری قانون کے ماہرین کا کہنا ہے کہ چونکہ علمائے کرام آج کے مروجہ قانونی سسٹم اور قوانین سے واقفیت نہیں رکھتے ،اسلیے ان کی رائے کوحتمی قرارنہیں دیا جاسکتا،اس کا آسان ساحل یہ تھا کہ ملک کے تعلیمی نظام میں تبدیلی کر کے ماہرین قانون کی ایسی کھیپ تیار کی جائے ،جوجدید قانونی نظام اورتقاضوں سے بھی پوری طرح واقف ہواورقرآن وسنت کے ضروری علوم میں بھی مہارت رکھتی ہواور جب تک وہ کھیپ تیار ہوکر معاملات سنبھالنے کی پوزیشن میں نہ آجائے عارضی طور پر''جوائنٹ سسٹم'' کے طور پر دونوں مل کراس فریضے کوسرانجام دیں ۔اگر پاکستان بننے کے فوراًایسا ہوجاتا تواب تک ہم عارضی دور سے گزر کرایک نئی تیارشدہ کھیپ کی صلاحیتوں سے بہرور ہورہے ہوتے ۔مگرفریقین میں کوئی سے بھی اس مقصد کے لیےآگے بڑھنے کوتیارنہیں ہے،نہ عصری کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دینی تعلیم کواس درجہ میں شامل کیا جارہاہے کہ قانو ن کی تعلیم پانے والوں کوقرآن وسنت اورفقہ اسلامی میں مہارت کادرجہ حاصل ہوجائے اورنہ ہی دینی مدارس جدید قانون اورتعلیم کی ضروریات سے اپنے فضلاء کواس سطح پر واقف کرانے کے لیے تیار ہیں کہ وہ جدیدقانون اورعصری قانونی سسٹم میں شریک ہونے کی صلاحیت حاصل کرسکیں،اسلیے گاڑی کھڑی ہےاورکشمکش جاری ہے۔

اس تنازع کا دوسرااختلافی نکتہ یہ ہے کہ علمائے کرام اس بات پر پوری دل جمعی کے ساتھ قائم ہیں کہ نفاذ اسلام کے لیے قانون سازی کا طریق کارفقہی اصولوں کے اسی دائرے میں رہے گا،جو چار یا پانچ فقہی مذاہب کی صورت میں گزشتہ تیرہ سوسال سے چلا آرہاہے،اورقانون سازی کے

جدید اصولوں اور تجربات سے استفادے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، جبکہ عصری قانونی ماہرین کا اصرار ہے کہ اسلامی قوانین کی تشکیل نو کے لیے قانون سازی کے جدید اصولوں کو، جن پر بہر حال مغرب کی چھاپ لگ چکی ہے، بنیاد بنایا جائے اور اسلامی احکام وقوانین کو پورے پرانے ڈھانچے کو قانون سازی اور دستور سازی کے جدید مغربی اصولوں کی روشنی میں ازسرنو تشکیل دیا جائے۔

علمائے کرام کے طریق کار اور موقف کو مخالف فریق کی طرف سے ''طالبائزیشن' کا طعنہ دیا جا رہا ہے جب کہ ایک عالم دین نے جواب آں غزل کے طور پر دوسرے فریق کے موقف اور طریق کار کا ''اسلامی تعلیمات کی امریکنائزیشن'' سے تعبیر کیا ہے ۔، بہر حال طالبائزیشن اور امریکنائزیشن کی یہ کشمکش ایک نئے دور میں داخل ہوگئی ہے، جب دونوں فریق سپریم کورٹ میں آمنے سامنے کھڑے ہوں گے، تو بڑی دل چسپ بحثیں سننے میں آئیں گی، نوک جھونک ہوگی، نکتہ رسی ہوگی، سوال وجواب کے مرحلے ہوں گے، اور اخبارات کو نئی نئی سرخیاں ملیں گی، البتہ یہ تسلی رہے کہ ہونا ہوانا کچھ بھی نہیں۔

ہمارے محترم جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب اس سلسلے میں اندر کی بات بتا چکے ہیں، وہ ''مسلہ لال فام'' میں لکھتے ہیں کہ ۱۹۵۸ء کے وسط میں مجھے سکندر مرزا (صدر پاکستان) نے کراچی طلب کیا، ان ایام میں معاہدہ بغداد سے وابستہ مما لک کی ہوائی فوج کے چند سربراہ پاکستان آئے ہوئے تھے، شہزادہ علی خان مرحوم اور کیبنٹ لاج بھی کراچی میں موجود تھے، سکندر مرزا نے ایک کھانے پر ان سب سے میری ملاقات کرائی دوسرے روز مجھے پھر بلوایا گیا، دراصل وہ یہ چاہتے تھے کہ میں کسی نہ کسی صورت میں معاہدہ بغداد کے سیکرٹریٹ سے منسلک ہو کر بغداد چلا جاؤں۔ میں نے کہا میں سات سال وطن سے باہر رہنے کے بعد واپس آیا ہوں، اس لیے فی الحال میری خواہش پاکستان کو خیر آباد کہنے کی نہیں ہے، انہوں نے نہایت خلوص سے فرمایا کہ میں تمہیں استعمال کرنا چاہتا ہوں، اگر تمہیں بغداد جانا منظور نہیں تو پھر تمہارا کیا ارادہ ہے؟ میں نے جواب دیا کہ ۱۹۵٦ء کے دستور کے تحت حال ہی میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے کمیشن کا تقرر کا اعلان کیا گیا ہے اگر آپ پسند فرمائیں تو مجھے اسکے ساتھ منسلک کر دیں! ممکن ہے میں اس سلسلے میں کوئی کار آمد خدمت

سرانجام دے سکوں یہ سن کر سکندر مرزا ہنس پڑے اور کہنے لگے ''مگر وہ کمیشن تو محض دکھاوے کے لیے وجود میں لایا گیا ہے، اس کا مقصد دراصل کچھ بھی نہیں کیونکہ نہ تو اسے کوئی کام کرنا ہے اور نہ ہم چاہتے ہیں کہ وہ کوئی کام کرے۔''

پاکستان میں نفاذ اسلام کی کہانی اتنی ہی ہے، اس سے زیادہ اگر کسی کوئی توقع ہو تو اس کی اس خوش فہمی کا ہماری موجودہ اسٹبلیشمنٹ اور سسٹم کے پاس کوئی علاج نہیں ہے، اس پر مجھے وہ مشہور کہاوت یاد آ رہی ہے کہ دو دوست کھانے کے لیے نچلے درجے کے کسی ہوٹل میں گئے، میز پر بیٹھے کسی بات پر ان کا جھگڑا ہو گیا اور اس کشمکش میں ان سے ہوٹل کا گلاس ٹوٹ گیا اور دونوں غصے کی حالت میں کھانا کھائے بغیر ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور ہوٹل سے باہر جانے لگے، جب وہ بل وصول کرنے والے کاؤنٹر کے قریب سے گزرے تو بیرے نے دور سے آواز لگائی ''کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا چار آنے''۔

(روزنامہ پاکستان، ١٧؍جولائی ٢٠٠٥)

اسلام کی تعبیر وتشریح اور قائداعظمؒ

سرحد اسمبلی میں شریعت ایکٹ کی منظوری کے بعد ایک بار پھر ملک بھر میں اسلام کی تعبیر وتشریح کے حوالے سے بحث میں شدت آ گئی ہے، اور اس سلسلے میں نئے مضامین اور بیانات منظر عام پر آنا شروع ہو گئے ہیں کہ جن اسلامی احکام اور قوانین کے نفاذ کی بات کی جارہی ہے، ان کی عملی شکل طے کرنے کے بعد معیار اور طریق کار کیا ہوگا اور ان کی تعبیر وتشریح کا حق کسے حاصل ہوگا؟ چنانچہ اس بارے میں فرزند اقبال جسٹس جاوید اقبال صاحب کا یہ دلچسپ بیان ایک قومی اخبار میں نظر سے گزرا کہ اسلام کی وہی تشریح پاکستان میں قبول کی جائے جو قائداعظم ملت نے کی ہے، اگرچہ سرحد اسمبلی نے منظور کردہ شریعت ایکٹ میں کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس سے موجودہ سسٹم کو اس قسم کا کوئی خطرہ محسوس ہونے لگے کہ صوبہ سرحد میں یہ سسٹم مذکورہ شریعت ایکٹ کے نفاذ سے کسی بھی درجہ میں متاثر ہوگا، اور مروجہ نظام کے وجود یا طریق کار کے لیے کوئی پریشان کن مسئلہ کھڑا ہو جائے گا ۔لیکن چونکہ اس سے قبل صوبہ سرحد کے پڑوس افغانستان میں شریعت کے نفاذ کے نام پر ایک سسٹم کو ختم کر کے اس کی جگہ دوسرا سسٹم نافذ کر دیا گیا تھا اور طالبان حکومت نے کمیونسٹ دور کے نظام حکومت کی کوئی علامت باقی نہیں رہنے دی تھی ،اس لیے ''دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے'' کے مصداق صوبہ سرحد میں شرعی قوانین کے نفاذ کے رسمی اعلان پر بھی ہر طرف ہاہا کار مچ گئی ہے، ورنہ جسے نظام کی تبدیلی یا سسٹم کا انقلاب کہتے ہیں ،سرحد اسمبلی کے منظور کردہ شریعت ایکٹ کے نفاذ سے اس کا دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

سرحد اسمبلی نے نہ صرف اتنا ہی کیا کہ ایک ایکٹ کے ذریعے طے کر لیا ہے کہ صوبہ سرحد میں صوبائی اختیارات کے دائرہ میں آنے والے احکام وقوانین کی تشریح قرآن وسنت کے مطابق کی جائے گی۔اور اسلامی ضوابط کی عمل داری کا اہتمام کیا جائے گا،جبکہ موجودہ دستوری صورت حال پر نظر رکھنے والے حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایل ایف او کی موجودگی میں صوبائی اختیارات کو کوئی متعین دائرہ باقی نہیں رہ گیا، بلکہ جبک تک سپریم کورٹ کے جج صاحبان پی سی او کے تحت فرد واحد کی دستوری ترامیم کی عمل داری کے حلف پر قائم ہیں اوران سے دستور کی وفاداری کا از سر نو حلف نہیں لے لیا جاتا۔تب تک دستور کے کسی دائرہ کار اوراس کے دیے ہوئے اختیارات کی عمل داری کی ضمانت اوراس سلسلہ میں عدالتی دادرسی کی عملی شکل موجود نہیں......اس لیے اگر کسی کو یہ خوش فہمی ہے کہ سرحد اسمبلی کے منظور کردہ شریعت ایکٹ سے صوبہ سرحد کے نظام میں کوئی تبدیلی آئے گی اوراس خطے کو نظام شریعت کی برکات سے بہرہ ور ہونے کا کوئی موقع ملے گا تو اس خوش عقیدگی اور رجائیت کے اظہار کے سوا کوئی عنوان نہیں دیا جاسکتا۔ورنہ ہمارے نزدیک اس ''شریعت ایکٹ '' کی حیثیت صرف اتنی ہے کی متحدہ مجلس عمل نے اپنے ووٹروں کو مطمئن کرنے کے لیے یہ بل صوبائی اسمبلی سے منظور کرادیا ہے کہ ہمارے بس میں جتنی بات تھی ،ہم نے کردی ہے اب آگے اگر اس کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آرہا یا مروجہ سسٹم شرعی قوانین کو اپنے اندر گھسنے کو موقع نہیں دے رہا تو اس سلسلہ میں ہم بے بس ہیں اوراس کی ذمہ داری ہم پر نہیں ، بلکہ مروجہ سسٹم اوراسے چلانے والوں پر عائد ہوتی ہے۔

ہمارے خیال میں متحدہ مجلس عمل نے صرف اس حد تک کیا ہے اور درست کیا ہے، یہ اسے ضرور کرنا چاہیے تھا، کیونکہ اس نے عوام سے شرعی قوانین کے نفاذ کے وعدے پر ہی ووٹ لیے ہیں اوراسے اگلے الیکشن میں پھر اپنے ووٹروں کے پاس جانا ہے،اس سے زیادہ کچھ کرنا صوبائی حکومت کے بس میں نہیں تھا،لیکن حیرت ہوتی ہے ان اصحاب دانش پر جو اس ساری صورت حال سے باخبر ہوتے ہوئے بھی آسمان سر پر اٹھائے ہوئے ہیں کہ صوبہ سرحد میں طالبان کا نظام آگیا ہے اور سرحد حکومت طالبان کے نقش قدم پر چل پڑی ہے۔....یہ طالبان والے نظام کا ہوا بھی خوب ہے، جس کا

ڈراوادے کر بہت سے دانش اوراپنی بصیرت ودانش کا سکہ جمانے میں مصروف ہیں حالانکہ یہ ہمارے سب دوست کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ طالبان کی حکومت کو طاقت کے زور پر ختم کیئے جانے کے بعد وہاں جو حکومت امریکہ کی حمایت اور پشت پناہی سے قائم ہوئی ہے۔اس کی سپریم کورٹ نے بھی شرعی حدود، مثلاً رجم کرنا، ہاتھ کاٹنا، کوڑے مارنا اوراس نوعیت کی دیگر اسلامی سزاؤں کو بدستور نافذ رکھا ہوا ہے۔

سپریم کورٹ کے فیصلے سے چند ماہ قبل کابل میں ویڈیو سنٹرز اور کیبل نیٹ کو پولیس نے زبردستی بند کرادیا تھا،اورابھی حال ہی میں سپریم کورٹ کا ایک اور حکم سامنے آیا ہے جس میں افغانستان کی عورتوں کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ گھر سے باہر برقعہ پہن کر نکلا کریں، گویا قوانین کے نفاذ اوراس کی تعبیر وتشریح کے حوالے سے ملا عمر کے موقف اور حامد کرزئی کی پالیسیوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہا، لیکن جب یہ اقدامات طالبان حکومت اور ملا عمر کی طرف سے تھے تو پوری دنیا میں طوفان کھڑا ہو گیا تھا کہ تہذیب تباہ ہوگئی ہے تمدن اور ثقافت کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے،اورانسانوں کی آزادی غصب کر لی گئی ہے لیکن اب وہی اقدامات کرزئی حکومت کی طرف سامنے آرہے ہیں تو اسلام آباد سے لیکر واشنگٹن تک کے ان اصحاب دانش کو اس طرح سانپ سونگھ گیا ہے، جیسے وہ سرے سے اس دنیا میں موجود ہی نہیں رہے ہوں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ یہی قوانین اسی انداز میں اوراسی تعبیر وتشریح کے ساتھ سعودی عرب میں بھی نافذ ہیں اور گزشتہ پون صدی سے مسلسل نافذ چلے آرہے ہیں مگر وہاں ان قوانین کا نفاذ کسی کے لیے تکلیف کا باعث نہیں ہے،اسکے ساتھ ہی یہ صورت حال بھی قابل توجہ ہے کہ صوبہ سرحد کا نفاذ شریعت ایکٹ کسی طرح بھی طالبان کے نظام اوراس طریق کار سے مطابقت نہیں رکھتا، طالبان نے حکومت کے زور پر اقتدار حاصل کیا تھا، جب کہ صوبہ سرحد کی حکومت عوام کی منتخب کردہ ہے ،طالبان نے کوئی دستور نافذ کیے بغیر امیر المومنین کے شخصی احکامات کے ذریعے نفاذ اسلام کی طرف پیش رفت کی تھی ،جبکہ صوبہ سرحد کی حکومت اوراسمبلی نے پہلے سے نافذ شدہ دستور کے دائرہ میں رہتے ہوئے اوراسکے دیے ہوئے اختیارات کے تحت ’’شریعت ایکٹ‘‘ منظور کیا ہے،اس طرح

طالبان کا سسٹم پورے ملک کے مروجہ نظام میں مکمل انقلاب کی علامت تھا، جب کہ سرحد اسمبلی کا ''شریعت ایکٹ'' چند جزوی اصلاحات وترامیم کے علاوہ کوئی نتیجہ نہیں دے سکے گا۔ نیز سرحد حکومت نے یہ بل منتخب صوبائی اسمبلی کے ذریعے نافذ کیا ہے، جب کہ طالبان کے ہاں منتخب اسمبلی کا سرے سے کوئی وجود نہیں تھا۔

اس واضح فرق کے باوجود سرحد حکومت کے نفاذ شریعت کے اقدامات کو طالبان طرز کے اسلام کے نفاذ کی کوشش قرار دے کر جو لوگ پوری دنیا کو اسلام اور پاکستان سے نفرت دلانے کی مہم جاری رکھے ہوئے ہیں، وہ نہ اسلام کے ساتھ کوئی خیر خواہی کر رہے ہیں اور نہ ہی ان کا طرز عمل پاکستان کے بارے میں ہمدردی اور خیر خواہی پر مبنی قرار دیا جا سکتا ہے۔ باقی رہی بات اسلام کی اس کی تعبیر وتشریح کی، جو بقول ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال صاحب کے قائداعظمؒ نے قرآن وسنت کی تشریح نے کی تھی، تو ہمارے علم میں ایسی کوئی تعبیر وتشریح اس دنیا میں موجود نہیں ہے، جسے قائداعظمؒ نے قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح اور شرعی قوانین کی تعبیر کی صورت میں تحریر کیا ہو اور یہ کہا ہو کہ پاکستان میں اسلام کا نفاذ اس تشریح کے مطابق ہوگا۔ اگر جسٹس جاوید اقبال صاحب کے علم میں قائداعظمؒ کا تحریر کردہ ''اسلامی قوانین'' کا کوئی مسودہ ہو تو اسے کسی لائبریری کے خفیہ زینت خانے بنانے کی بجائے سامنے لایا جانا چاہیے۔

ہماری معلومات کے مطابق جنوبی ایشیا کے اس خطے میں سرکاری طور پر قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح اور اسلامی قوانین کی تدوین اور تشکیل کے لیے سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے فتاویٰ عالمگیری کے بعد اگر کوئی علمی کام ہوا ہے تو اسلامی جمہوریہ پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل کا وہ کام ہے جسے متحدہ مجلس عمل کی سرحد حکومت نے نفاذ شریعت کے لیے بنیاد تسلیم کیا ہے۔ اگر محترم جسٹس جاوید اقبال صاحب کو اس پر کوئی اعتراض ہے اور ان کے پاس اسلامی قوانین کا کوئی اس درجے کا متبادل مسودہ موجود ہے تو ہماری مودبانہ درخواست ہے کہ وہ اسے قوم کے سامنے لائیں، ورنہ قائداعظمؒ کے نام کو ملک میں شریعت کے کسی بھی اقدام کو روکنے کے لیے ''بریکر'' کے طور پر استعمال کرنا نہ قائداعظمؒ کے ساتھ انصاف ہے اور نہ ہی جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب جیسی محترم

اور دانا و بینا شخصیت کو زیب دیتا ہے۔

(روزنامہ پاکستان، ۲۰ جون ۲۰۰۳)

حسبہ بل پر عدالت عظمیٰ کا نیا فیصلہ

بعض اخباری رپورٹوں کے مطابق صوبہ سرحد کے وزیر قانون ملک ظفر اعظم سپریم کورٹ آف پاکستان میں ''حسبہ بل'' کے مقدمہ میں ناکامی پر دل برداشتہ ہو گئے ہیں اور وزارت سے مستعفی ہونے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ حسبہ بل صوبہ سرحد میں ایم ایم اے کی حکومت نے عوامی سطح پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام قائم کرنے کے لیے پیش کیا تھا، جسے صوبائی اسمبلی نے منظور بھی کر لیا لیکن وفاقی حکومت کی طرف سے چیلنج کیے جانے کے بعد سپریم کورٹ آف پاکستان نے اس بل کی تین دفعات کو دستور کے منافی قرار دے دیا ہے جس کی وجہ سے یہ بل ایکٹ کی صورت اختیار نہیں کر سکا۔ اس سے قبل بھی حسبہ بل صوبائی اسمبلی سے منظور ہونے کے بعد سپریم کورٹ میں چیلنج ہوا تھا اور عدالت عظمیٰ نے اس پر اعتراضات لگائے تھے جس پر صوبائی وزارت قانون نے اسے از سر نو مرتب کر کے صوبائی اسمبلی میں پیش کیا اور وزیر قانون ملک ظفر اعظم نے کہا کہ اس میں سپریم کورٹ کے اعتراضات اور روایات کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے لیکن سپریم کورٹ نے ان کے اس موقف کو تسلیم نہیں کیا اور تین دفعات کو دستور کے منافی قرار دے کر واپس کر دیا جس پر ملک ظفر اعظم کی دل برداشتگی اور استعفیٰ کی خبریں آ رہی ہیں۔ ملک صاحب کا تعلق جمیعت علماء اسلام سے ہے اور جمیعت کے حلقوں کی طرف سے خبر آئی ہے کہ ان کے استعفیٰ پر یکم مارچ کو غور کیا جائے گا۔ جہاں تک ''حسبہ بل'' کا تعلق ہے اس کا بنیادی مقصد معاشرے میں اسلامی اقدار کا فروغ اور غیر اسلامی رسوم و رواج اور روایات و اقدار کی حوصلہ شکنی کے لیے ''محتسب اعلیٰ'' کی سربراہی میں ایک

نظام قائم کرنا ہے جس سے متعلقہ افراد کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اپنے اپنے دائرہ کار میں اس بات کی نگرانی کریں کہ قرآن وسنت کے معاشرتی احکام میں سے کس پر عمل ہو رہا ہے اور کس کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہو رہی ہے اور اس سلسلے میں جو کوتاہی نظر آئے اس کا قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے نوٹس لیں اور ضروری کاروائی کریں۔ ایم ایم اے کی صوبائی حکومت کا موقف یہ ہے کہ یہ اس کی دینی اور دستوری ذمہ داریوں میں سے ہے جب کہ وفاقی حکومت اور ایم ایم اے کے سیاسی مخالفین کا کہنا ہے کہ یہ روایتی انتظامیہ اور عدلیہ سے ہٹ کر ایک متوازن نظام قائم کرنے کے مترادف ہے جو ایم ایم اے کی حکومت اپنے کارکنوں کو نوازنے کے لیے قائم کر رہی ہے۔

جہاں تک روایتی انتظامی اور عدالتی نظام سے ہٹ کر عوامی سطح پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظام کا تعلق ہے تو یہ اسلامی روایات کا حصہ رہا ہے اور خلافت راشدہ سے لے کر بعد کی مسلم خلافتوں کے ادوار تک اس امر کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے کچھ افراد اپنے محلے، شہر اور علاقے پر نظر رکھیں اور شرعی احکام کی خلاف ورزی روکنے کی کوشش کریں، جس کے لیے ایک مخصوص حد تک انہیں تعزیری اختیارات بھی حاصل رہے ہیں۔ موجودہ دور میں یہ نظام سعودی عرب میں موجود ہے اور ایک حد تک آزاد کشمیر میں بھی یہ نظام کام کر رہا ہے اور اس کی بنیاد قرآن کریم کے اس ارشاد گرامی پر ہے کہ ''ہم اہل ایمان کو جب زمین میں اقتدار دیتے ہیں تو وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ کا اہتمام کرتے ہیں، لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں'' (سورۃ الحج، آیت نمبر ۴۱) جناب نبی کریم ﷺ نے بیسوں ارشادات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اہتمام کی بطور خاص تلقین فرمایا کرتے تھے، باقی رہی بات روایتی قانونی اور عدالتی نظام سے ہٹ کر اس کے لیے کوئی الگ طریق کار اور ڈھانچہ ترتیب دینے کی تو اسے متوازی نظام قرار دینا ہمارے خیال میں درست نہیں ہے، اس لیے کہ اس نے بھی تو دستور اور قانون کے دائرہ میں رہ کر اپنا کام کرنا ہے اور مروجہ نظام میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ یہ بات فرنگی دور سے چلی آ رہی ہے کہ عام عدالتی نظام سے ہٹ کر سوسائٹی میں کچھ افراد کو ''آنریری مجسٹریٹ'' کا درجہ دے دیا جاتا ہے اور انہیں ایک حد تک اختیارات بھی حاصل ہوتے ہیں، ملک کے عمومی عدالتی نظام کی موجودگی میں خصوصی عدالتوں کا قیام بھی اسی روایت کا

حصہ ہے اور قانون میں ملک کے مالیاتی نظام کو درست رکھنے کے تمام تر ضابطوں اور قواعد کے ہوتے ہوئے بھی نیب کا الگ نظام قائم کیا گیا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بسا اوقات بعض خرابیاں اس حد تک بڑھ جاتی ہیں کہ مروجہ نظام روایتی نظام کے تحت ان کا راستہ روکنا مشکل ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے الگ خصوصی انتظامات ضروری ہو جاتے ہیں البتہ یہ بات ضروری ہے کہ ملک کے دستور کی حدود کی پابندی کی جائے اور کوئی ایسا راستہ اختیار نہ کیا جائے کہ اس سے سے دستور کے تقاضوں کی نفی ہوتی ہو، اس لیے عدالت عظمیٰ کا یہ فیصلہ بہر حال واجب عمل اور واجب احترام ہے کہ اگر حسبہ بل یا کسی بھی اور بل میں دستور کی کسی شق کی خلاف ورزی ہوتی ہیں تو اسے درست کر کے دستور کے مطابق بنایا جائے مگر اس پس منظر میں ہم سپریم کورٹ آف پاکستان بالخصوص چیف جسٹس افتخار محمد چودہری کو ایک پہلو کی طرف توجہ دلانا مناسب خیال کرتے ہیں کہ جہاں دستور کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی کا نوٹس لینا عدالت عظمیٰ کی ذمہ داری ہے وہاں ہمارے خیال میں کسی دفعہ پر عمل نہ ہونے اور دستور میں کیے گئے کسی وعدہ کے پورا نہ کیے جانے کا نوٹس لینا بھی سپریم کورٹ آف پاکستان کے دائرہ اختیار میں ہے اور عدالت عظمیٰ کو اس سلسلے میں لوگوں کی شکایات اور مشکلات کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

موجودہ دستور ۱۹۷۳ء میں نافذ ہوا تھا اور یہ کسی فرد واحد کا بنایا ہوا دستور نہیں بلکہ ملک کی منتخب دستور ساز اسمبلی نے کئی ماہ کی بحث و تمحیص اور طویل غور و خوض کے بعد اسے منظور کیا تھا۔ اس دستور میں دو باتوں کی ضمانت دی گئی تھی، ایک یہ کہ پارلیمنٹ قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون سازی نہیں کر سکے گی اور دوسری یہ کہ ملک میں جتنے قوانین بھی موجود ہیں انہیں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کی روشنی میں قانون سازی کے باضابطہ عمل کے ذریعے قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالا جائے گا، اس کے لیے دستور کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا جس نے سالہا سال کی محنت کے بعد ملک کے تمام قوانین کے بارے میں ایک جامع رپورٹ وزارت قانون کے حوالے کی جو وزارت قانون کے فریزر میں منجمد پڑی ہے جب کہ ملک کا عام شہری سوالیہ نشان بنا ہوا ہے کہ پاکستان کا قیام اسلامی معاشرہ کی تشکیل اور قرآن و سنت کی عملداری کے اہتمام کے لیے

عمل میں آیا تھا، اس سلسلے میں قائداعظم محمد علی جناح کے واضح ارشادات اور وعدوں کو کم وبیش ۶۵ برس کا عرصہ گزر رہا ہے اور دستور پاکستان نے ۱۹۷۳ء میں اس بات کی ضمانت دی تھی کہ ملک کے تمام قوانین کو قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھالا جائے گا اور آئندہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کی جائے گی، اس دستوری ضمانت کو بھی ۳۴ برس گزر گئے ہیں مگر حضور! ملک میں نفاذ اسلام کی دلی دور نظر آتی ہے اور عام شہریوں کی مایوسیوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور یہ منظر ان کی پریشانیوں اور مایوسیوں میں مزید شدت پیدا کر رہا ہے کہ قرارداد مقاصد کی دستور میں بالادست حیثیت تسلیم نہ کرنے پر عدالت عظمیٰ کا فیصلہ موجود ہے، سود کے قوانین کے خاتمہ کو روکنے کے لیے بھی عدالت عظمیٰ کا فیصلہ سامنے ہے اور اب حسبہ بل کو دوبارہ اعتراضات کے ساتھ واپس کرنے کا فیصلہ بھی آگیا ہے۔ ہم ان سب فیصلوں کا احترام کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہماری یہ بھی خواہش ہے کہ اگر اسلامی نظام کے نفاذ کے بارے میں دستوری ضمانت کی مسلسل خلاف ورزی کا نوٹس لیتے ہوئے بھی ہماری عدالت عظمیٰ کوئی ٹھوس فیصلہ صادر فرما دے تو اس سے توازن قائم ہو جائے گا اور قیام پاکستان کے نظریاتی ہدف کی طرف پیش رفت کی راہ بھی ہموار ہو جائے گی۔

(روزنامہ اسلام، ۲۸ فروری ۲۰۰۷)

رویت ہلال کا مسئلہ

رویت ہلال پر سرحد اسمبلی کی متفقہ قرارداد

سرحد اسمبلی کی اس متفقہ قرارداد نے رویت ہلال کے مسئلے پر ایک بار پھر ہلچل پیدا کر دی ہے کہ مرکزی رویت ہلال کو توڑا دیا جائے اور رمضان المبارک اور عیدین وغیرہ کے نظام کو سعودی عرب کے ساتھ منسلک کر کے، جس روز سعودیہ میں چاند کا اعلان ہو، اسکے مطابق روزہ اور عید کا پاکستان میں بھی اعلان کر دیا جائے، گزشتہ سال رمضان المبارک اور عید الفطر کے چاند کے حوالے سے صوبہ سرحد اور باقی ملک میں جو بدمزگی پیدا ہو گئی تھی، اس کے پس منظر سرحد اسمبلی کی یہ متفقہ قرارداد خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ جس کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر بحث کا سلسلہ جاری ہے، سرحد اسمبلی میں یہ متفقہ قرارداد عوامی نیشنل پارٹی کی طرف سے پیش کی گئی، جسے متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے حکومتی پارٹی مجلس عمل کی تائید بھی حاصل ہے، اور متحدہ مجلس عمل میں چونکہ ملک کے تمام مذہبی مکاتب فکر کے لوگ موجود ہیں اس لیے اسے صرف سیاسی قرارداد کا درجہ حاصل نہیں رہا، بلکہ مختلف مکاتب فکر کے کردہ علمائے کرام کی رضامندی کی جھلک بھی اس میں نمایاں طور پر دکھائی دے رہی ہے۔

ہمارے ہاں کچھ عرصہ قبل تک رمضان المبارک اور عیدین کے چاند کا مسئلہ خاصی پریشانی کا باعث رہا ہے، کوئی مرکزی نظام نہ ہونے کی وجہ سے ملک کے مختلف حصوں میں چاند کا الگ الگ دیکھنے ہوتا تھا، جس کے ساتھ مسلکی اختلافات کا پس منظر بھی شامل ہو جاتا تھا، بسا اوقات ایک ہی شہر میں دو دو دن عید ہو جایا کرتی تھی، مرکزی رویت ہلال کمیٹی کی تشکیل کے بعد اس صورت حال میں

خاصا فرق آیا اور اگرچہ صوبہ سرحد کے بعض علاقوں میں پھر بھی الگ عید ہو جاتی تھی، مگر عام طور پر ملک بھر میں رمضان المبارک اور عیدین کا نظام مربوط ہو گیا تھا، اور ملک کی اکثریت ایک روز عید منانے لگی تھی، اس میں رخنہ گزشتہ سال پیدا ہوا، جب صوبہ سرحد کی رویت ہلال کمیٹی نے رمضان المبارک کے چاند کے سلسلے میں مرکزی رویت ہلال کمیٹی کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا اور اس سے صوبہ سرحد کے ایک بڑے حصے میں رمضان اور عید کا نظام باقی ملک سے الگ ہو گیا۔

مرکزی رویت ہلال کمیٹی کا موقف یہ تھا کہ چونکہ وہ حکومت کی طرف سے مجاز اتھارٹی ہے اور اس نے رویت ہلال کی کوئی تسلی بخش شہادت نہ ملنے کی وجہ سے ۲۹ شعبان کی شام کو چاند نظر نہ آنے اور شعبان کے ۳۰ دن مکمل کرنے کا اعلان کر دیا تھا، اس لیے پورے ملک کو اس فیصلے کی پابندی کرنی چاہیے تھی، جب کہ سرحد کی صوبائی حکومت اور رویت ہلال کمیٹی کا یہ کہنا تھا کہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی نے چاند نہ ہونے کے فیصلے میں جلد بازی کی تھی اور فیصلے کے اعلان کے بعد موصول ہونے والی شہادتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، اس لیے اسے شرعی اصولوں کے مطابق شہادتوں کی بنیاد پر رمضان المبارک کے شروع ہو جانے کا اعلان کرنا پڑا، یہی صورت حال عید الفطر پر پیش آئی اور دو متضاد اعلانات کی وجہ سے عام لوگوں کے لیے پریشانی کی صورت حال پیدا ہو گئی۔

سرحد اسمبلی نے اس کا حل یہ نکالا ہے کہ سرے سے پاکستان میں چاند دیکھنے کا اہتمام ترک کر کے سعودی عرب کے اعلان کے ساتھ روزے اور عیدین کو منسلک کر دیا جائے، تا کہ صرف ملک بھر میں بلکہ ایک ہی روزہ اور عید ہو، بلکہ عید اور روزہ کے حوالے سے عرب ممالک کے ساتھ اتحاد اور یک جہتی کی فضا قائم ہو جائے، ہم اس سے قبل کسی موقع پر عرض کر چکے ہیں کہ سرحد کے بعض علاقوں میں باقی ملک سے ایک دن پہلے عید اور روزہ رکھنے کی وجہ رویت ہلال افغانستان کے ساتھ ہم آہنگی کا جذبہ ہے اور افغانستان میں چاند دیکھنے کا سرے سے اہتمام نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ سعودی عرب کے اعلانات سے روزہ اور عید کرتے ہیں، اس سلسلہ میں ان موقف یہ ہے کہ ہم چونکہ حنفی ہیں اور احناف کا مذہب یہ ہے کہ چاند کے مطالع مختلف ہونے کا شرعاً اعتبار نہیں ہے، اس لیے دنیا کے کسی بھی حصے میں چاند نظر آنے کا شرعی ثبوت ہو جائے تو ہم روزہ اور عید کرنے کے پابند ہیں، جب

کہ حرمین شریفین ساری دنیائے اسلام کی عقیدت واحترام کا مرکز ہیں، اس لیے وہاں روزہ اور عید کا اعلان ہوجانے کے بعد دنیا میں کہیں اور چاند دیکھنے کی ضرورت نہیں اور حرمین شریفین کے ساتھ ساری دنیائے اسلام کو روزہ اور عید کا ایک ہی روز اہتمام کرنا چاہیے۔

جہاں تک اس حقیقت کا تعلق ہے کہ چاند کے طلوع ہونے میں سائنسی طور پر دنیا کے مختلف حصوں میں وقت کا فرق موجود ہے، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک علاقے میں ایک روز چاند نظر آتا ہے اور اس سے دور دوسرے علاقے میں دوسرے روز پہلی رات کا چاند کا دکھائی دیتا ہے، چاند کی گردش کے حوالے سے ایسا نہ ممکن ہے بلکہ اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے لیکن کیا شرعاً اس کا اعتبار ضروری ہے؟ اور کیا ایسا کرنا درست نہیں ہے کہ ایک جگہ چاند نظر آجائے تو باقی دنیا کے لوگ اسی کا اعتبار کرتے ہوئے ایک ہی روز روزہ اور عید کا اہتمام کرلیں؟ اسے فقہی اصطلاح میں اختلاف مطالع کا اعتبار کرنے یا نہ کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں فقہائے امت کے دو گروہ ہیں، حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے اسے فتاوی محمودیہ میں اور حضرت مولانا زوار حسین شاہ آف کراچی نے عمدۃ الفقہ''میں اس کی جو تفصیل بیان کی ہے اسکے مطابق حنفی، حنبلی اور مالکی مذاہب کے ائمہ اختلاف مطالعہ نہیں کرتے اور اور انکا یہ ارشاد ہے کہ دنیا کے کسی بھی حصے میں چاند نظر آنے کا ثبوت ہوجائے تو باقی دنیا کے لیے اسکی پابندی ضروری ہوجاتی ہے، البتہ شافعی فقہ کے ائمہ اور احناف میں سے امام زیلعی اور سید انور شاہ کشمیری اختلاف مطالع کا اعتبار کرتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ جہاں چاند دیکھنے میں ایک دن کا فرق پڑ جائے، وہاں مطالع کا اختلاف معتبر اور ایک جگہ چاند نظر آنے سے دوسری جگہ کے لوگوں پر روزہ اور عید لازم نہیں ہوتے۔

ہمارے ہاں پاکستان میں اگرچہ عمل اب تک دوسرے قول پر ہو رہا ہے لیکن اہل سنت کے تینوں مکاتب فکر، یعنی بریلوی، دیوبندی، اور اہل حدیث کے اکابر علمائے کرام نے صراحت کی ہے کہ ان کے نزدیک مطالع کا اختلاف شرعاً معتبر نہیں ہے اور دنیا میں کسی ایک جگہ بھی چاند کا شرعی ثبوت مل جانے کی صورت میں باقی ساری دنیا کے مسلمان اس کے پابند ہوجاتے ہیں، چنانچہ بریلوی فکر کے ممتاز مفتی حضرت مولانا امجد علی اعظمی بہار شریعت میں لکھتے ہیں ''ایک جگہ چاند ہوا تو وہ

صرف وہیں کے لیے نہیں، بلکہ تمام جہان کے لیے ہے، مگر دوسری جگہ اسکا حکم اس وقت ہے کہ ان کے نزدیک اس کی تاریخ میں چاند ہونا شرعاً ثابت ہو جائے۔''

دیوبندی مکتب فکر کے ایک بہت بڑے مفتی حضرت مولا ما مفتی عزیز الرحمانؒ نے فتاوی دارالعلوم دیوبند میں صراحت کی ہے کہ مطالعہ کا اختلاف عملا موجود ہے لیکن احناف کے نزدیک شرعاًاس کا اعتبار نہیں ہے اور اگر مغرب میں چاندنظر آجانے کا ثبوت شرعی ہوجائے تو اہل مشرق اس کے مطابق روزہ کھنے اور عید کرنے کے پابند ہیں۔ اہل حدیث مکتب فکر کے ہاں قاضی شوکانیؒ کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے اور''فتاوی محمودیہ'' میں مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے قاضی شوکانی کی ایک طویل عبارت نقل کی ہے۔جس میں انہوں نے کہا کہ مطالع کے اختلاف کا شرعاً اعتبا رنہیں ہے، اسکا مطلب یہ ہے کہ جمہور فقہائے احناف کے ساتھ ساتھ حنبلی اور مالکی فقہ کے ائمہ کرام کے درمیان اس مسئلے پر کوئی اختلاف نہیں۔

اہل حدیث مکتب فکر کے قاضی شوکانی بھی اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا کے مختلف حصوں میں پہلی رات کا چاند نظر آنے کے اوقات میں فرق موجود ہونے کے باوجود مطالع اس اختلاف کا شرعاً اعتبار کرنا ضروری نہیں ہے اور دنیا کے کسی بھی حصے میں چاند نظر آنے کی صورت میں باقی دنیا کے مسلمان بھی اسی روز عید اور روزہ کا اہتمام کر سکتے ہیں، اس لیے ان بزرگوں کی بات مان کر نہ صرف ملک بھر میں ایک ہی روزے اور عید کا اہتمام کر ممکن ہے، بلکہ عرب مما لک کے ساتھ عید اور روزہ میں ہم آہنگی بھی ہوسکتی ہے۔اس لیے ہمارے نزدیک سرحد اسمبلی کی یہ متفقہ قرارداد ملک بھر کے دینی حلقوں اور ارباب حل وعقد کی سنجیدہ توجہ کی مستحق ہے، پاکستان کے عوام کی ایک مدت سے خواہش ہے کہ وہ سب ایک دن ہی عید منائیں اور اکٹھے روزہ رکھیں۔ان کی یہ خواہش ناجائز نہیں ہے، ااسے پورا کرنے میں شرعاً بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہے اور فقہائے امت کی بڑی تعداد ان کے اس حق کی حمایت کررہی ہے تو پاکستان کے تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علمائے کرام کو بھی اس پر غور کرنا چاہیے، ان کے مل بیٹھ کر نیا اجتہادی فیصلہ کرنے سے عوام کو یہ خوشی مل سکتی ہے تو اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ (روزنامہ پاکستان، ۱۵/اکتوبر۲۰۰۴)

رویت ہلال کا مسئلہ۔قائدین توجہ فرمائیں!

رویت ہلال کا مسئلہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد حسن جان کے استعفیٰ کے بعد مزید تشویشناک صورت اختیار کر گیا ہے۔قومی اخبارات میں شائع ہونے والے ایک بیان میں مولانا حسن جان نے فرمایا ہے کہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئر مین مولانا منیب الرحمٰن نے کمیٹی کے دیگر حاضر ارکان کے مشورے اور رائے پر توجہ دینے کی بجائے ذاتی فیصلے پر آڑے رہنے کو ترجیح دی ہے جس کی وجہ سے ۲۸ راکتوبر کو چاند نظر نہ آنے کا اعلان ان کا ذاتی فیصلہ ہے کمیٹی کا فیصلہ نہیں ہے۔نیز وفاقی وزیر اطلاعات اور سیکرٹری مذہبی امور نے اس سلسلہ میں جو بیانات دیئے ہیں وہ ہتک آمیز ہیں۔دوسری طرف مولانا مفتی منیب الرحمٰن کا کہنا ہے کہ کمیٹی کے ارکان نے اس کے فیصلے پر دستخط کئے ہیں اس لیے یہ کمیٹی کا فیصلہ ہے مگر صوبہ سرحد میں ایم ایم اے کی حکومت نے اس میں مداخلت کی ہے اور اس فیصلے کو سبوتاژ کرنے کے لیے سرکاری ذرائع استعمال کئے جارہے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ وفاقی حکومت کو ان کے فیصلے پر عملدرآمد کا اہتمام کرنا چاہیے اور اس سے اختلاف کرنے والوں کو گرفتار کرنا چاہیے۔

اس کے ساتھ ہی کراچی، ملتان اور لاہور کے جن سرکردہ علماء کرام کی طرف سے احتیاطاً ایک روزے کی قضا کا مشورہ دیا گیا ہے وہ دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ دوسری طرف بریلوی مکتب فکر کے سرکردہ علماء کرام نے مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئر مین کے اعلان کے دفاع میں بیانات دیئے ہیں جس سے اس مسئلہ پر مسلکی بنیاد پر تفریق کے خطرات دکھائی دینے لگے ہیں۔

مرکزی رویت ہلال کمیٹی کی ساکھ اور اعتماد کا بحال رہنا بھی ضروری ہے ورنہ آئندہ رمضان المبارک اور عیدین کے متفقہ اعلان کے امکانات کم سے کم تر ہوتے چلے جائیں گے۔

عیدالفطر قریب آرہی ہے اور اس سے قبل فریقین کو قریب لانا اور کسی متفقہ فیصلے کا راستہ نکالنا ضروری ہے ورنہ خلفشار بڑھ سکتا ہے جس سے مرکزی رویت ہلال کمیٹی کی ساکھ اور اعتماد مجروح ہونے کے علاوہ چاند کا مسئلہ سیاسی اور مسلکی جھگڑوں کی نذر ہونے کا امکان ہے۔ ہمارے خیال میں متحدہ مجلس عمل کی ہائی کمان ہی اس سلسلہ میں فوری طور پر کوئی موثر رول ادا کرسکتی ہے۔ اگر مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا فضل الرحمٰن، قاضی حسین احمد، پروفیسر ساجد میر اور مولانا سمیع الحق باہمی مشورے سے دل چسپی لیں تو فریقین کو بٹھایا جاسکتا ہے اور مشترکہ حل کی کوئی صورت نکالی جاسکتی ہے۔

اس ضمن میں اب تک کی صورتحال کے حوالہ سے کراچی سے بعض ذمہ دار حضرات کی طرف سے ایک رپورٹ موصول ہوئی ہے جو قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے اس گزارش کے ساتھ کہ عالمی اور قومی سطح پر جو لابیاں دینی حلقوں کے اتحاد سے پریشان ہیں اور ان میں خلفشار پیدا کرنے کی تاک میں ہیں ہمیں ان کو آگے بڑھنے کا موقع نہیں دینا چاہیے اور باہم مل بیٹھ کر مسئلہ کے حل کی کوئی صورت نکال لینی چاہیے۔

رپورٹ درجہ ذیل ہے:

''اس مرتبہ رمضان المبارک کے چاند کے سلسلے میں جو صورتحال پیدا ہوگئی ہے وہ انتہائی افسوسناک ہے لیکن مزید افسوس اس بات کا ہے کہ اخبارات میں مسئلے کی جو تصویر عوام کے سامنے آئی ہے اس میں چند اہم حقائق جو اس سلسلے میں کلیدی اہمیت رکھتے ہیں منظر عام پر نہیں آئے۔ تاثر یہ پایا جارہا ہے کہ جو لوگ چیئرمین رویت ہلال کمیٹی کے اعلان سے اختلاف کررہے ہیں یا اسے مشکوک قرار دے رہے ہیں وہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کی مخالفت کررہے ہیں، حالانکہ صحیح صورتحال یہ ہے کہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی اگر اتفاق رائے یا اکثریت سے کوئی فیصلہ کرتی تو اسکے واجب التعمیل ہونے میں کسی کو شبہ نہیں تھا، مشکل اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کی تاریخ میں

پہلی بار خود کمیٹی کے درمیان ایسا اختلاف ہوا جس میں صرف چیئر مین ایک طرف تھے اور کمیٹی کے دوسرے حاضر ارکان دوسری طرف، اس سلسلے میں واقعات کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

مرکزی رویت ہلال کمیٹی کا جو اجلاس پشاور میں اتوار ۲۶/اکتوبر کو مغرب کے وقت ہوا تھا اس میں چیئر مین رویت ہلال کمیٹی کے علاوہ مندرجہ ذیل صرف تین اراکین شریک ہوئے۔

(۱) شیخ الحدیث مولانا حسن جان صاحب، پشاور

(۲) جناب شبیر احمد کاکاخیل۔ ماہر فلکیات اسلام آباد

(۳) جناب قاری عبدالرشید صاحب، کوئٹہ، بلوچستان

۱۔ ساڑھے سات بجے کمیٹی کی طرف سے چیئر مین نے ریڈیو اور ٹی وی پر چاند نظر نہ آنے کا اعلان کر دیا۔

۲۔ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے تینوں ارکان کی رائے یہ تھی کہ چونکہ ابھی ملک کے مختلف اطراف سے رابطہ قائم ہے، اس لیے ابھی نفی کا حتمی اعلان کرنے کے بجائے انتظار کرنا چاہیے اور چاند نظر نہ آنے کے اعلان میں اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیے، مگر بہر حال اعلان ساڑھے سات بجے کر دیا گیا۔

لیکن مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے دو ارکان شیخ الحدیث جناب مولانا حسن جان صاحب اور جناب شبیر احمد کاکاخیل وہیں موجود رہے تاکہ اگر گواہیاں آئیں تو چیئر مین کو اطلاع دے کر اجلاس دوبارہ بلا لیا جائے۔

۳۔ جب قلات (بلوچستان)، بنو، ہنگو، پنج پیر (سرحد) وغیرہ سے چاند دیکھے جانے کی اطلاعات فون پر موصول ہوئیں اور ان مقامات کے علماء کرام نے فون پر بتلایا کہ انہوں نے گواہیاں شرعی قاعدے کے مطابق وصول کی ہیں تو چیئر مین کو اس کی اطلاع دی گئی اور کمیٹی کا اجلاس دوبارہ ہوا۔

۴۔ چیئر مین جناب مفتی منیب الرحمٰن صاحب نے پیر ہی کے روز جبکہ صوبہ سرحد میں روزہ تھا دارالعلوم کراچی کے سربراہ مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی کو ان کے استفسار پر یہ تفصیل بتائی تھی کہ

پہلے اجلاس میں ہم چار افراد شریک تھے (جن کے نام اوپر بیان ہوئے ہیں) اور دوسرے اجلاس میں ہم صرف تین افراد شریک تھے، ایک یعنی میں چیئر مین، دوسرے مولانا حسن جان صاحب، اور تیسرے جناب شبیر احمد کاکاخیل صاحب جبکہ چوتھے جناب قاری عبدالرشید صاحب کوئٹہ واپس جا چکے تھے۔ ان دو ارکان کمیٹی نے گواہیوں کو قبول کر لیا اور میں نے کہا کہ میں پچھلے فیصلے پر قائم ہوں، نئی گواہیوں پر اگر کوئی روزہ رکھنا چاہے تو رکھ لے۔

مذکورہ بالا تفصیل کو سامنے رکھ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کا دوسرا اجلاس جو عشاء کے بعد ہوا اس میں کمیٹی نے کوئی متفقہ فیصلہ نہیں کیا بلکہ اس فیصلے میں اختلاف تھا، جیسا کہ ۲۷/ اکتوبر کے اخبارات کی رپورٹ سے بھی ظاہر ہے، مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے دونوں حاضر ارکان کی رائے یہ تھی کہ موجود شہادتوں کی بنیاد پر پیر کے دن روزے کا فیصلہ کر دیا جائے۔ اور چیئر مین کی رائے مختلف تھی، ایسی صورت میں کمیٹیوں اور عدلیہ کے مسلمہ اصولوں کے مطابق چیئر مین صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ ارکان کی اکثریت کے مطابق فیصلے کا اعلان کر کے اپنی رائے بطور اختلافی رائے ذکر فرما دیتے، لیکن انہوں نے ایسا کرنے کی بجائے یہ اعلان کیا کہ میں اپنے پچھلے فیصلے پر قائم ہوں، جو لوگ نئی شہادتوں کی بنیاد پر پیر کے روز روزہ رکھنا چاہیں وہ روزہ رکھ لیں۔

لہذا اب صورتحال یہ ہے کہ ایک طرف کمیٹی کے ارکان کی متفقہ رائے ہے اور دوسری طرف چیئر مین کا اعلان، حالانکہ صدر پاکستان کی طرف سے پورے ملک میں رویت ہلال کا فیصلہ کرنے کا اختیار صرف چیئر مین کو نہیں دیا گیا بلکہ کمیٹی کو دیا گیا ہے جس کا ایک حصہ چیئر مین بھی ہے اور چیئر مین نے اپنے آخری اعلان میں فیصلے کو کمیٹی کے بجائے خود اپنی طرف منسوب کیا اور ساتھ ہی دوسری شہادتوں کے بارے میں خود ہی یہ بھی کہا کہ جو لوگ ان کی بنیاد پر روزہ رکھنا چاہیں رکھ لیں، اس اعلان کی وجہ سے صورتحال زیادہ مشکوک اور مبہم ہو گئی۔

اس افسوسناک اور مبہم صورتحال کے لیے پہلے ہی دن سے یہ کوشش کی گئی کہ اس ابہام کا ازالہ خود مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے ذریعہ سے ہو جائے اور جناب چیئر مین اور دوسرے معزز ارکان

سے براہ راست ان کا موقف معلوم کر کے کسی ایک متفقہ نتیجے پر پہنچا جاسکے اورخود مرکزی رویت ہلال کمیٹی ہی کی طرف سے صورتحال کی وضاحت ہوجائے تا کہ ملک میں کوئی خلفشار پیدا نہ ہو۔ چنانچہ مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی نے پیر ۲۷/اکتوبر ہی کے دن چیئرمین مرکزی رویت ہلال کمیٹی جناب مفتی منیب الرحمٰن صاحب کوفون کر کےصورتحال دریافت کی توانہوں نے اس اختلاف کا ذکر کیا جوان کے اورارکان مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے درمیان پیش آیا تھا۔مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب نے ان سے کہا کہ بہتر ہوگا کہ اس مسئلہ کےحل کے لیے ہم سب کا باہمی مشورہ ہوجائے مگر انہوں نے کہا کہ میں آج ہی دبئ جارہا ہوں اور ۳/نومبر کو واپس آؤں گا،مفتی صاحب نے ان سے درخواست کی کہ مسئلہ بہت اہم ہے، پورے ملک کے دارالافتاؤں ،علماء وعوام کی طرف سے سوالات آنے شروع ہوگئے ہیں اگر متفقہ فیصلے میں تاخیر ہوئی تو پورے ملک میں خلفشار پیدا ہونے کا اندیشہ ہے،اس نزاکت کے پیش نظر آپ اگر اپنا سفر ایک دوروز کے لیے ملتوی کردیں تو بہتر ہے،مگر انہوں نے انکار کیا،مفتی صاحب نے ان سے پھر کہا کہ آپ اپنا دبئ کا نمبر ہمیں دے دیں تا کہ مشورہ کے لیے آپ سے رابطہ کی ضرورت ہوتو رابطہ کیا جاسکے۔انہوں نے کہا کہ ایسا کوئی نمبر میرے پاس نہیں۔البتہ وہاں جانے کے بعد ایسا کوئی فون نمبر دستیاب ہوگیا تو اطلاع کردوں گا اور جب ۳/نومبر کو واپس آجاؤں گا تو کوئی مشورہ بھی ہوسکے گا اوراس میں آپ کو بھی بلالیا جائے گا۔مگر انہوں نے دبئ جانے کے بعد کوئی نمبر دیا اور نہ وہاں سے آنے کے بعد کوئی رابطہ کیا۔اس کے برعکس جس رات کو وہ دبئ گئے اس سے اگلی صبح کو اخبارات میں ایک مسلک کی کئی تنظیموں کے بیانات شائع کرائے گئے کہ چیئرمین کا فیصلہ بالکل درست ہے،ان تنظیموں کے پاس اس دعوے کی کیا دلیل تھی وہ آج تک معلوم نہ ہوسکی۔اسی اثنا میں مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے دونوں حاضر ارکان اور بلوچستان کے قاری عبدالرشید صاحب سے اور ملک کے ماہر فلکیات سے نیز بنوں،ہنگو،پنج پیر،کوئٹہ،قلات،پشین اور دیگر مقامات پر جن علماء کرام نے شہادتیں جمع کی تھیں ان تمام کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں اور یہ معلومات کراچی،سندھ اور پنجاب کے تمام اہم دارالافتاء میں بھیجی گئیں اوران سے درخواست کی گئی کہ ان معلومات کی روشنی میں خالص فقہی اور شرعی نقطہ نظر سے غور کیا جائے جن میں

مولانا مفتی منیب الرحمٰن صاحب کا مدرسہ جامعہ نعیمیہ کراچی بھی شامل تھا۔

رویت ہلال کمیٹی کے جن ارکان نے پیر کے روزے کی رائے دی تھی ان سے رابطہ کے دوران یہ بات بھی واضح ہوئی کہ انہوں نے پشاور اور چارسدہ کی ان شہادتوں پر اعتماد نہیں کیا جو روایتی طور پر ناقابل قبول سمجھی جاتی ہیں بلکہ پشاور سے وصول ہونے والی شہادتوں کو مسترد کر دیا تھا، نیز متعدد ماہرین فلکیات سے جن میں سپارکو کے ایک ماہر فلکیات کے علاوہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے ایک رکن جناب شبیر کاکاخیل بھی شامل ہیں یہ معلوم ہوا کہ اتوار ۲۷ ؍اکتوبر کو چاند نظر آنا مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا، کیونکہ چاند کی عمر اس وقت ۲۴ گھنٹے ہو چکی تھی جبکہ نظر آنے کا امکان ۱۸ ؍۱۷ گھنٹے کے بعد ہو جاتا ہے۔

چونکہ پیش نظر یہ تھا کہ مسئلہ کو خالص شرعی بنیادوں پر حتی الامکان اتفاق رائے سے حل کیا جائے اس لیے چیئرمین رویت ہلال کمیٹی کی طرف سے کوئی جواب نہ آنے کے بعد علامہ شاہ احمد نورانی سے مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے فون پر رابطہ کیا اور ان کی قیام گاہ پر ۱۱ ؍نومبر کو بعد تراویح مجلس مشاورت طے ہوئی، جس میں چیئرمین مرکزی رویت ہلال کمیٹی مولانا مفتی منیب الرحمٰن صاحب کو بھی دعوت دی گئی، مگر جب دعوت دینے کے لیے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے ان سے رابطہ کیا تو انہوں نے تشریف آوری کا وعدہ کرنے کے بجائے یہ کہا کہ میں علامہ شاہ احمد نورانی سے رابطہ کر کے جواب دوں گا لیکن پھر ان کا کوئی جواب نہ آیا، بالآخر شاہ احمد نورانی صاحب کی طرف سے ناسازی طبع کی بنا پر مجلس مشاورت منسوخ کر دی گئی۔

چونکہ عشرہ آخیرہ قریب آ رہا ہے اور پورے ملک سے سوالات کی بھر مار تھی مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین صاحب سے مشاورت کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں اس لیے کراچی کے جن اداروں کے علماء کرام کو مختصر وقت میں جمع کرنا ممکن ہوا ان کی ایک مجلس مشاورت جامعہ دارالعلوم کراچی میں ۱۲ ؍نومبر کو منعقد کی گئی جس میں جامعہ دارالعلوم کراچی کے علاوہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن، جامعہ فاروقیہ، جامعہ بنوریہ، اشرف المدارس اور جامعہ دارالخیر وغیرہ شامل تھے سب حضرات کا اس بات پر اتفاق تھا کہ صورتحال چونکہ مبہم ہے اس لیے ملک میں کوئی خلفشار پیدا ہونے

سے بچاؤ کی ہر ممکن کوشش کرتے ہوئے اور کسی پر کوئی الزام عائد کئے بغیر، لوگوں کو خالص دینی بنیاد پر احتیاط کا مشورہ دیدیا جائے۔ چنانچہ اس اجتماع نے رمضان کی تاریخ تبدیل کر کے یا روزے کی قضاء واجب ہونے کا فتویٰ دینے کے بجائے مندرجہ ذیل اعلامیہ جاری کیا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله و كفىٰ و سلام على عباده الذين اصطفى

آج بتاریخ ۱۱ر نومبر ۲۰۰۳ء کراچی کے اہل فتویٰ علماء کا ایک اجتماع دارالعلوم کراچی (کورانگی) میں ہوا جس میں رمضان المبارک کے چاند کے سلسلے میں رویت ہلال کمیٹی کے اختلافی فیصلے سے پیدا ہونے والے مسائل پر غور کیا گیا اور متعلقہ حالات و واقعات اور شرعی احکام پر غور و خوض کے بعد حسب ذیل قرارداد متفقہ طور پر منظور کی گئی:

''ہم پاکستان کے مسلمانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ اس مرتبہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے اختلافی اور مبہم فیصلے کی وجہ سے ۲۷ر اکتوبر کو چاند نظر آنے یا نہ آنے کے بارے میں صورتحال کم از کم مشکوک ضرور ہوگئی ہے، لہٰذا جن حضرات نے پیر ۲۷ر اکتوبر کو روزہ نہیں رکھا وہ احتیاطاً ایک روزے کی قضا کر لیں اور احتیاطاً اعتکاف ۱۵ر نومبر کی شام سے شروع کر دیا جائے''۔

صورتحال کی یہ وضاحت ان حقائق کو سامنے لانے کے لیے کی گئی ہے جن کی پوشیدہ ہونے کی وجہ سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اس کا مقصد خدانخواستہ کوئی بحث و مباحثہ کی فضا پیدا کرنا نہیں، نہ کسی کی مخالفت یا موافقت مقصود ہے۔ تمام اہل علم اور عوام سے یہ دردمندانہ اپیل ہے کہ خالص عبادت کے مسئلہ کو مسلمانوں میں تفرقہ کا ذریعہ نہ بنایا جائے اور اگر اختلاف رائے بھی ہو تو اس کو علمی حد تک محدود رکھا جائے۔

(روزنامہ اسلام، ۲۰ر نومبر ۲۰۰۳)

چاند کا مسئلہ: مشترکہ دینی قیادت کی آزمائش

رویت ہلال کا مسئلہ اس سال قومی سطح پر متنازعہ صورت اختیار کرنا نظر آ رہا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس مسئلے کو سنجیدگی کے ساتھ حل کرنے کی فوری کوشش نہ کی گئی، تو عید الفطر کے موقع پر یہ خلفشار وسیع تر صورت اختیار کر جائے گا، اور قوم متفقہ یا کم از کم اکثریتی عید کے ثواب ولطف سے محروم ہو جایے گی۔ اب سے ربع صدی قبل بلکہ اس سے بھی پہلے ہمارے طالب علمی کے دور میں یہ صورت حال عام طور پر پیش آ جاتی تھی کہ چاند کی رویت کے مسئلہ پر اختلاف ہو جاتا تھا اور بسا اوقات ایک شہر میں دو دن الگ الگ عید منائی جاتی تھی، رویت ہلال یا چاند کے اعلان کے سرکاری نظام پر اعتماد نہ ہونے کی وجہ سے عام طور پر علمائے کرام سرکاری اعلان پر بھروسہ کرنے کی بجائے چاند کی رویت اور اعلان کا خود اہتمام کرتے تھے، مسلکی وعلاقائی رجحانات بھی اس کا باعث بن جایا کرتے تھے۔ کہ ایک دوسرے کے اعلان پر اعتماد کرنے پر علیحدہ اہتمام کو ترجیح دی جاتی تھی اور رمضان اور عید باہمی اختلاف کا شکار ہو جاتے تھے، ایک بار ایسا بھی ہوا کہ عید کے سرکاری اعلان کو قبول نہ کرنے پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا احتشام الحق تھانویؒ اور مولانا مفتی محمد حسین نعیمیؒ جیسے اکابر علمائے کرام گرفتار کر لیے گئے اور انہیں کم وبیش ایک ماہ جیل میں رہنا پڑا۔ اس کے بعد علمائے کرام کے اس مطالبے کو تسلیم کر لیا گیا کہ رویت ہلال کا نظام تمام مکاتب فکر کے سرکردہ اور نمائندہ علمائے کرام کی ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے اور حکومت اس کمیٹی کے فیصلوں پر عملدرآمد کی ذمہ داری قبول کرے۔ مختلف مکاتب فکر کے ذمہ دار حضرات مشورہ کے بعد

شریک کرنے کی روایت قائم ہوئی ور بڑے بڑے علمائے کرام کی موجودگی کی وجہ سے آہستہ آہستہ اعتماد کی یہ فضا قائم ہوتی گئی کہ ملک کے اکثر حصوں میں رویت ہلال کا کوئی متبادل انتظام کرنے کی بجائے مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے فیصلے کو قبول کیا جانے لگا اور خوشگوار صورت سامنے آنے لگی کہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کو اس سلسلے میں فیصلہ کن اور مجاز اتھارٹی کا درجہ حاصل ہو گیا، اگرچہ اس کے بعد بھی چند مخصوص علاقوں میں اس سے الگ عمل ہوتا رہا، مگر مجموعی طور پر رمضان المبارک، عید الفطر اور عید الاضحیٰ کا تعین متفقہ طور پر ہونے لگا۔ مگر اس سال اعتماد واتحاد کی یہ فضا مجروح ہوتی دکھائی دی رہی ہے؛۔

ہماری معلومات کے مطابق حالات وواقعات کی ترتیب کچھ اس طرح ہے کہ ۲۶ اکتوبر اتوار کو مرکزی رویت ہلال کمیٹی کا اجلاس پشاور میں کمیٹی کے چیئر مین مفتی منیب الرحمٰن کی زیر صدارت منعقد ہوا، جس میں کمیٹی کے مستقل اارکان میں سے ان کے علاوہ صرف تین ارکان مولانا حسن جان آف پشاور، جناب شبیر احمد کاکاخیل، اور قاری عبدالرشید آف کوئٹہ شریک تھے۔ ساڑھے سات بجے تک کسی جگہ سے چاند نظر آنے کی اطلاع موصول نہ ہونے پر کمیٹی کے چیئر مین مولانا مفتی منیب الرحمان نے طے کیا کہ چاند نہ آنے کا اعلان کر دیا جائے، جب کہ کمیٹی کے دیگر شرکاء نے رائے دی کہ ابھی حتمی اعلان نہ کیا جائے بلکہ کچھ مزید انتظار کر لیا جائے، مگر چیئر مین نے اس رائے کو قبول نہ کرتے ہوئے ساڑھے سات بجے ریڈیو اور ٹی وی پر اعلان کر دیا کہ ملک کے کسی حصے سے چاند دیکھے جانے کے اطلاع نہیں ملی۔ اس لیے رمضان المبارک کا آغاز پیر کی بجائے منگل ۲۸ اکتوبر کو ہوگا، اسکے چیئر مین اور قاری عبدالرشید وہاں سے روانہ ہو گئے جبکہ دوسرے دوارکان مولانا حسن جان اور شبیر احمد کاکاخیل وہیں بیٹھے رہے، ان کا خیال تھا کہ اگر اس کے بعد کوئی شہادت یا اطلاع موصول ہو تو وہ چیئر مین سے گزارش کر کے کمیٹی کا دوبارہ اجلاس طلب کر لیں گے، چنانچہ ایسے ہی ہوا اسکے بعد مختلف اطراف سے شہادتیں اور اطلاعات موصول ہونا شروع ہوئیں، اس دوران پشاور سے شہادتیں موصول ہوئیں جن پر ان دونوں حضرات نے قناعت نہیں کی، مگر بنوں، ہنگو، پنج پیر، کوئٹہ اور پشین سے اطلاعات موصول ہوئیں کہ ان مقامات پر چاند دیکھا گیا، اور علمائے کرام نے شرعی بنیا

دیر شہادتیں لی ہیں تو مولانا محمد حسن جان اور جناب شبیر احمد کاکاخیل نے مولانا مفتی منیب الرحمٰن سے رابطہ کیا اور وہ تشریف لے آئے ،مگر انہوں نے ان اطلاعات اور شہادتوں کو قبول کرنیکی بجائے سابقہ فیصلہ پر قائم رہنا مناسب سمجھا اور فرمایا کہ وہ اپنے اعلان پر قائم ہیں ان نئی اطلاعات اور شہادتوں کی بنیاد پر جو حضرات پیر کو روزہ رکھنا چاہیں رکھ لیں۔

یہ ہے اس اختلاف کا نقطہ آغاز جس کے بعد رمضان المبارک کے چاند کے بارے میں اختلافی بیانات کا سلسلہ شروع ہوگیا ،جو بڑھتے بڑھتے اس مقام تک پہنچ گیا کہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے رکن شیخ الحدیث مولانا حسن جان نے کمیٹی کی رکنیت سے احتجاجاً استعفٰی دے دیا ہے اور کراچی کے سرکردہ علمائے کرام نے رویت ہلال کمیٹی کے سلسلہ میں کمیٹی کے چیئرمین مولانا مفتی منیب الرحمٰن کے اعلان پر شک کا اظہار کرتے ہوئے ایک اعلامیہ میں عوام کو مشورہ دیا ہے کہ جن لوگوں نے پیر کو روزہ نہیں رکھا وہ عید کے بعد احتیاطاً یہ روزہ قضا کریں اور اعتکاف بھی ایک روز پہلے شروع کیا جائے۔ایک قومی روزنامے میں شائع ہونے والے بیان کے مطابق مولانا حسن جان نے تین باتوں کو اپنے احتجاجی استعفٰی کی بنیاد بنایا ہے ،ایک یہ کہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین نے کمیٹی کے دوسرے ارکان کی رائے کو درخور اعتنا نہیں سمجھا اور اپنے ذاتی فیصلے پر اڑے رہے ،دوسری یہ کہ وفاقی وزیر اطلاعات شیخ رشید احمد کا بیان بھی خاصا توہین آمیز تھا ،تیسری یہ کہ وفاقی وزیر مذہبی کے سیکرٹری کا یہ اخباری بیان ہتک آمیز ہے کہ ”سابقہ فیصلہ تبدیل کرانا شرارت پسند عناصر کی طرف سے تھا“۔

مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین مولانا مفتی منیب الرحمٰن کا جو موقف اخبارات کے ذریعے سامنے آیا ہے ،وہ یہ ہے کہ صوبہ سرحد کی حکومت نے رویت ہلال کمیٹی کو ہائی جیک کرنے کی کوشش کی ،انہوں نے غیر متعلقہ لوگوں اور وزراء کو اجلاس میں بٹھایا جو سراسر غلط تھا ،انہوں نے کہا کہ حکومت کی مقرر کردہ کمیٹی کے فیصلے کا مذاق اڑایا جارہا ہے ،اور اس کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا جارہا ہے ،اس طرح حکومت نے کمزوری دکھائی تو پھر کسی فیصلے پر بھی عمل نہیں کرایا جاسکے گا ،کمیٹی کا اجلاس پشاور میں کرانا درست نہ تھا ،کیونکہ وہاں ایم ایم اے کی حکومت نے اپنی من مانی کرائی

اوراس مقصد کے لیے پولیس کواستعمال کیا گیا،انہوں نے اسلام آباد سے ہدایات لینے کی بات میں بھی کوئی صداقت نہیں ہے اوررویت ہلال کمیٹی کے دیگر ارکان کی مخالفت کی بات بھی سراسر الزام تراشی ہے فیصلہ پران لوگوں کے دستخط موجود ہیں،کیاان سے ڈنڈے کے زور پر دستخط کرائے گئے تھے؟

اس صورت حال میں کراچی کے سرکردہ علمائے کرام بالخصوص دارالعلوم کراچی کے سربراہ مفتی محمد رفیع عثمانی نے اس کوشش کا آغاز کیا ہے کہ مسئلے کوزیادہ بگڑنے سے روکا جائے اور باہمی مصالحت کی صورت نکال لی جائے ،انہوں نے مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئر مین مولانا مفتی منیب الرحمٰن سے رابطہ کیا کہ باہم مل بیٹھ کرکوئی متفقہ راستہ اختیار کرلیا جائے ،جس پرانہوں نے جواب دیا کہ وہ دوبئ جارہے ہیں واپسی پر دیکھیں گے،دوبئ سے واپسی پران سے دوبارہ رابطہ کیا گیا،تو بھی باہمی ملاقات ومشاورت کی کوئی صورت طے نہ ہوسکی،اس پرجسٹس (ر) مفتی محمد تقی عثمانی متحدہ مجلس عمل کے سربراہ احمد شاہ نورانی سے بات کی اور یہ مشورہ ہوا کہ ۱۱نومبرکوتراویح کے بعد مولانا نورانی کی قیام گاہ پرمشترکہ اجلاس ہوجائے،جس میں مفتی منیب الرحمٰن سے بھی شرکت کی گزارش کی جائے،مگر یہ اجلاس بھی منعقد نہ ہوسکا اوراسکے بعد دارالعلوم کراچی میں علمائے کرام کے اجلاس میں یہ اعلامیہ جاری کیا گیا کہ ”ہم پاکستان کے مسلمانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ اس مرتبہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے اختلافی اورمبہم فیصلے کی وجہ سے ۲۶اکتوبرکوچاندنظرآنے یانہ آنے کے بارے میں صورت حال کم از کم مشکوک ضرور ہوگئی ہے ،لہذاجن حضرات نے پیر۲۷اکتوبر کو روزہ نہیں رکھا وہ احتیاطاًایک روزہ کی قضا کرلیں،اوراحتیاطاًاعتکاف ۱۵نومبرکی شام سےشروع کردیاجائے۔

اب تک حاصل شدہ معلومات کی بنیاد پرواقعات کی ترتیب کامختصراتذکرہ کرنے کے بعدراقم الحروف اس سلسلے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ اس سارے تنازع میں اختلاف کے تین بنیادی نکات سامنے آئے ہیں۔

۱۔مولانا مفتی منیب الرحمٰن کا ارشاد ہے کہ ۲۶اکتوبر کو چاندنظرنہ آنے کا ان کااعلان کمیٹی کا فیصلہ ہے،جس کی تعمیل لازمی ہے،اس سےعلمائے کرام کواختلاف نہیں کرنا چاہیےاورحکومت کواس پر

عمل درآمد کا اہتمام کرنا چاہیے، جبکہ اختلاف رکھنے والے علماء کا موقف یہ ہیکہ چاند نظر نہ آنے کا فیصلہ صرف چئیر مین کا تھا جوان کا ذاتی فیصلہ ہے اور کمیٹی کے دیگر ارکان ان سے متفق نہیں تھے، اس لیے اسے کمیٹی کا فیصلہ قرار دے کر واجب التعمیل کہنا درست نہیں ہے۔

۲۔ مفتی منیب الرحمٰن کو شکایت ہے کہ سرحد میں ایم ایم اے کی حکومت نے رویت ہلال کے مسئلہ میں مداخلت کی ہے اور فریق کا کردار ادا کیا ہے جو درست نہیں ہے۔

۳۔ مولانا حسن جان کا ارشاد ہے کہ وفاقی وزیر اطلاعات اور سیکرٹری امور مذہبی نے ایک خالص دینی اور علمی مسئلے پر طعن و تشنیع کے انداز میں بیان بازی کر کے علمائے کرام کی توہین کی ہے جو ناقابل برداشت ہے۔

ہمارے خیال میں مسئلہ کو آگے بڑھنے سے روکنا چاہیے اور سنجیدہ حلقوں کو اس معاملہ میں مداخلت کر کے باہمی اتفاق رائے کی کوئی صورت نکال لینی چاہیے۔

اس ضمن میں وفاقی وزیر اطلاعات شیخ رشید احمد اور صوبہ سرحد کے وزیر امور مذہبی حافظ اختر علی کے جو بیانات اخبارات میں آئے ہیں وہ ہمارے نزدیک تشویشناک ہیں، اس لیے کہ وفاقی حکومت اور سرحد حکومت کے درمیان یا وفاقی حکومت اور متحدہ مجلس عمل کے درمیان معاملات جس انداز میں چل رہے ہیں اس سے خطرہ ہے کہ رمضان اور عید کے مسائل کہیں سیاسی جھگڑوں کی بھینٹ نہ چڑھ جائیں، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ؛

☆ اس مسئلے کو مسلکی تفریق اور سیاسی جھگڑوں سے بالاتر رکھنا ضروری ہے اور

☆ رمضان المبارک کے چاند کے سلسلہ میں کمیٹی کے چئیر مین کے فیصلے پر اہل علم کو علمی بنیاد پر جو اشکال ہے، اسکا ازالہ بھی ضروری ہے۔

ہمارے خیال میں اگر مولانا احمد شاہ نورانی، مولانا فضل الرحمٰن، قاضی حسین احمد، پروفیسر ساجد میر، اور مولانا سمیع الحق باہمی مشاورت کے ساتھ مداخلت کریں اور فریقین کو اپنے ساتھ بٹھا کر کسی متفقہ فیصلے پر لانے کی کوشش کریں تو عید کے موقع پر قوم کو کسی وسیع تر خلفشار سے بچایا جا سکتا ہے۔

(روزنامہ پاکستان، ۲۱ر نومبر ۲۰۰۳)

عیدالفطر پر تذبذب کی صورت حال اور اس کا حل

عیدالفطر گزر گئی ہے اور ملک بھر میں روایتی جوش وخروش کے ساتھ منائی گئی ہے۔ رویت ہلال کا تنازع حسب توقع عید کے موقع پر بھی قائم رہا۔ صوبہ سرحد کی رویت ہلال کمیٹی نے اپنے فیصلے کو درست قرار دیتے ہوئے پیر کی شام کو اجلاس طلب کر لیا اور سینکڑوں شہادتوں کی بنیاد پر فیصلہ صادر کر دیا کہ عیدالفطر ۲۵ رنومبر منگل کو ہوگی۔ صوبہ بلوچستان کی رویت ہلال کمیٹی نے بھی اس حد تک صوبہ سرحد کا ساتھ دیا کہ چاند دیکھنے کے لیے اجلاس پیر کی شام کو طلب کر لیا، مگر کوئی شہادت نہ ملنے کی وجہ سے بدھ کی عید کا اعلان کر دیا، جبکہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین مولانا مفتی منیب الرحمٰن اپنے سابقہ فیصلے پر قائم رہے اور نہ صرف پیر کو کمیٹی کا اجلاس طلب کرنے سے انکار کر دیا بلکہ اس شام کو چاند دیکھے جانے کے بارے میں صوبہ سرحد کی رویت ہلال کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والی شہادتوں کو بھی رد کر دیا۔ اس تنازع کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ صوبہ سرحد کے بیشتر حصوں میں منگل کو عید منائی گئی اور باقی تین صوبوں اور صوبہ سرحد کے بعض علاقوں میں بدھ کو عید ہوئی۔ اخباری اطلاعات کے مطابق پشاور شہر میں بھی یہ صورت حال رہی کہ بہت سے لوگ عید منا رہے تھے، جبکہ بعض حضرات روزے سے بھی تھے جنھوں نے دوسرے روز عید کی، حتیٰ کہ گورنر سرحد نے بھی وفاق کا نمائندہ ہونے کی بنا پر بدھ کو نماز عیدالفطر ادا کی۔

یہ صورت حال خلاف توقع نہیں تھی۔ ہم اسی کالم میں یہ عرض کر چکے تھے کہ اگر مرکزی رویت ہلال کمیٹی اور صوبہ سرحد کی رویت ہلال کمیٹی کے درمیان یا مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین اور

ارکان کے مابین تنازع کو ختم کرانے کے لیے عید سے قبل فریقین کو بٹھانے اور مصالحت کرانے کی سنجیدہ کوشش نہ کی گئی تو عید الفطر خلفشار کا شکار ہو جائے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اگرچہ خلفشار کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں ہوئی، مگر رویت ہلال کے حوالے سے ایک نئی بحث کا آغاز ہو گیا ہے جو صرف اس لحاظ سے نئی ہے کہ ایک طویل وقفے کے بعد یہ بحث دوبارہ شروع ہوئی ہے، ورنہ اس میں زیر بحث آنے والے مسائل اور نکات میں کوئی نکتہ ایسا نہیں ہے جس پر اس سے قبل تفصیل کے ساتھ گفتگو نہ ہو چکی ہو کیونکہ کم وبیش ربع صدی پہلے طویل مباحثے کے بعد قومی سطح پر اس بات پر اتفاق رائے ہو گیا تھا کہ مختلف مکاتب فکر کے سرکردہ علمائے کرام پر مشتمل مرکزی رویت ہلال کمیٹی قائم کی جائے اور عید یا رمضان المبارک کے چاند کے بارے میں اسی کے اعلان کو حتمی تصور کیا جائے۔

ہمارے خیال میں اس تنازع سے رونما ہونے والے خلفشار کا دائرہ وسیع نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ بلوچستان کی رویت ہلال کمیٹی کو عید کا چاند پیر کی شام کو دیکھنے جانے کی شہادتیں نہیں ملیں ورنہ رمضان المبارک کے چاند میں کوئٹہ کی رویت ہلال کمیٹی پشاور کی رویت ہلال کمیٹی کے ساتھ متفق تھی اور اگر عید کے چاند میں بھی دونوں کا اتفاق ہو جاتا تو اس خلفشار کا دائرہ ملک کے دوسرے حصوں تک بڑھ سکتا تھا، اس لیے کہ کراچی کے ایک ذمہ دار مفتی صاحب نے مجھے ذاتی طو ر پر بتایا ہے کہ کراچی کے جن علمائے کرام نے رمضان کے چاند کے بارے میں مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے اعلان کو کسی حد تک مشکوک قرار دے کر اعتکاف احتیاطاً ایک دن پہلے بیٹھنے اور احتیاط ہی کے طور پر ایک روزہ قضا کرنے کا جو اعلامیہ جاری کیا تھا، اس میں پشاور کی رویت ہلال کمیٹی کا اعلان اصل بنیاد نہیں بنا تھا، بلکہ کوئٹہ کی رویت ہلال کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والی شہادتوں اور مذکورہ کمیٹی کے فیصلے کے باعث کراچی کے چند سرکردہ علمائے کرام نے یہ اعلان کرنا ضروری سمجھا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر عید کے چاند کے بارے میں کوئٹہ کی رویت ہلال کمیٹی کو چند شہادتیں مل جاتیں اور وہ منگل کی عید کا فیصلہ کر دیتی تو کراچی اور دوسرے شہروں کے ان علمائے کرام کے لیے بھی منگل کو عید نہ کرنے کا اعلان مشکل ہو جاتا جو اس سے قبل قوم کو اعتکاف ایک دن پہلے بیٹھنے اور ایک روزے کی احتیاطاً قضا کرنے کا مشورہ دے چکے تھے۔

ہمارے ہاں گوجرانوالہ میں پیر کی شام تک تذبذب کی فضا موجود تھی۔ بہت سے مراکز میں جہاں ۲۹ ویں شب کو تراویح میں قرآن کریم ختم کرنے کا عرصہ سے معمول چلا آ رہا ہے۔ انھوں نے احتیاطاً ایک روز قبل ۲۸ ویں شب کو قران کریم مکمل کر لیا تھا اور چونکہ اس قسم کے معاملات میں مرکزی جامع مسجد کے اعلان کو شہر میں زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، اس لیے مغرب کے بعد سے ہی فون پر لوگوں نے سوال کرنا شروع کر دیا تھا اور جب پشاور کی رویت ہلال کمیٹی نے مبینہ طور پر سینکڑوں شہادتوں کی بنیاد پر منگل کی عید کا اعلان کر دیا تو ان رابطوں میں اضافہ ہو گیا اور بعض بزرگوں نے مجھ سے یہ تقاضا شروع کر دیا کہ مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کی طرف سے بھی منگل کو عید منانے کا اعلان کر دیا جائے مگر میرے پیش نظر تین باتیں تھیں۔ ایک یہ کہ کراچی، لاہور، اسلام آباد اور دیگر بڑے شہروں کے دیوبندی علمائے کرام کا موقف کیا ہے؟ اسے معلوم کرنا چاہیے اور جو فیصلہ بھی ہو، اس کا اعلان اجتماعی طور پر کرنا چاہیے تا کہ خلفشار کو کم سے کم دائرے میں محدود کیا جا سکے۔ دوسری بات یہ تھی کہ کم وبیش ربع صدی کی محنت کے ساتھ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کا اعتماد اور ساکھ اس درجے پر آئی ہے کہ اس کے اعلان کو رویت ہلال کے بارے میں قومی سطح پر حتمی تصور کیا جاتا ہے، اس لیے ایک وقتی تنازع اور اختلاف کی وجہ سے اس ساکھ اور اعتماد کو مجروح کرنے کی کوئی صورت اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ تیسرا مسئلہ یہ تھا کہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین مولانا مفتی منیب الرحمٰن کے رمضان المبارک کے چاند کے بارے میں اعلان سے اختلاف کرنے والے سب علمائے کرام دیوبندی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں اور انھوں نے رمضان المبارک کے دوران میں اس اختلاف کے اظہار کے مختلف مراحل میں سے کسی مرحلے میں بھی اس بات کا اہتمام نہیں کیا کہ وہ اپنے اختلاف کے بارے میں دوسرے مسالک کے علمائے کرام کو بھی اعتماد میں لیں جس کی وجہ سے عملی صورت حال یوں ہو گئی تھی کہ مولانا مفتی منیب الرحمٰن کے فیصلے سے اختلاف صرف دیوبندی مکتب فکر کی طرف سے سامنے آیا اور دوسرے مکاتب فکر مثلاً اہل حدیث اور اہل تشیع نے اپنی خاموشی کی صورت میں مفتی صاحب کے موقف کا ساتھ دیا۔ اس صورت حال میں پنجاب اور سندھ میں منگل کی عید کا اعلان فرقہ وارانہ تنازع کی شکل اختیار کر سکتا تھا اور میں نے کبھی خود کو ایسی صورت حال کے

لیے ذہنی طور پر تیار نہیں پایا، اس لیے مقامی سطح پر کسی مشاورت کا اہتمام کرنے کے بجائے میں نے بڑے شہروں کے علماے کرام سے رابطہ قائم کرنے کو ترجیح دی اور جب نصف شب کے قریب کراچی، لاہور، اسلام آباد اور راول پنڈی کے ذمہ دار علما نے مجھے فون پر بتایا کہ انھوں نے بدھ کے روز عید کا فیصلہ کر لیا ہے تو میں نے بھی مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کی طرف سے دوستوں کو بتا دیا کہ ہم بھی بدھ ہی کو عید کریں گے۔

اس طرح عملاً اس بات بھی وہی ہوا جو اس سے قبل کئی بار ہو چکا ہے کہ پشاور اور کچھ دیگر علاقوں میں ای روز پہلے عید ہوئی اور باقی ملک نے دوسرے دن عید منائی۔ البتہ اس بار فرق یہ تھا کہ صوبائی حکومت اس مسئلے میں فریق بن گئی جو اسے نہیں بننا چاہیے تھا۔ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت کا چاند کے مسئلے پر فریق بننا درست نہیں ہے، اس سے خلفشار پیدا ہوگا۔ سرحد حکومت کو یہ مسئلہ رویت ہلال کمیٹی کے ارکان کے درمیان ہی رہنے دینا چاہیے اور اس میں فریق کا کردار ادا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن ''رموز مملکت خویش خسرواں بدانند'' کے مصداق سرحد حکومت نے فریق بننے کو ترجیح دی جس سے خود سرحد حکومت کو نقصان پہنچا ہے۔

گزشتہ روز چند نوجوان علماے کرام میرے پاس تشریف لائے اور انھوں نے سوال کیا کہ جب پشاور کے سرکردہ اور ذمہ دار علماے کرام نے کہا ہے کہ ان کے سامنے پیر کی شام کو عید کا چاند دیکھے جانے کی سینکڑوں شہادتیں پیش ہوئی ہیں تو ملک کے دیگر حصوں کے علماے کرام نے ان کی اس بات کو قبول نہیں کیا؟ میں نے عرض کیا کہ اس کا ایک جواب تو وہ ہے جو حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی نے دی اہ یکہ سرحد کی صوبائی رویت ہلال کمیٹی کے فیصلے کا اطلاق صرف صوبہ سرحد پر ہوتا ہے، ملک کے دوسرے حصوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں مفتی صاب موصوف نے یہ بات پاکستان کے مختلف حصوں کے مطالع مختلف ہونے کے مبینہ اصول کو تسلیم کرتے ہوئے کہی ہے یا حکومتی اتیار اور صواب دید کے دائرۂ کار کو سامنے رکھ کر یہ جواب دیا ہے۔ اس کی وضاحت مفتی صاحب ہی بہتر طور پر کر سکتے ہیں، مگر ان کے اس جواب سے یہ نیا سوال پیدا ہو گیا ہے کہ پاکستان میں رویت ہلال کے بارے میں اعلان کا حتمی اختیار صرف مرکزی رویت ہلال کمیٹی کو حاصل ہے یا

علاقائی رویت ہلال کمیٹیاں بھی الگ طور پر یہ اختیار رکھتی ہیں؟

البتہ میرے نزدیک پشاور کے علمائے کرام کا فیصلہ باقی ملک میں قبول نہ کیے جانے کی وجہ اس کہاوت کے ذریعے سے زیادہ بہتر طور پر سمجھ میں آ سکتی ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ ایک لڑکے نے گاؤں سے باہر جا کر ایک ٹیلے پر چڑھ کر اعلان کیا کہ لوگو، اپنا بچاؤ کر لو، شیر آ گیا ہے۔ گاؤں میں بھاگ دوڑ شروع ہو گئی، مگر تھوڑی دیر کے بعد پتہ چلا کہ شیر کہیں سے نہیں آیا، اس لڑکے نے مذاق کیا ہے۔ ایک آدھ بار اس لڑکے نے پھر ایسا کیا تو تھوڑی بہت ہلچل ہوئی، مگر زیادہ لوگوں نے اس میں دلچسپی نہ لی۔ ایک روز ایسا ہوا کہ فی الواقع ایک شیر گاؤں کی طرف آ گیا جس پر اسی لڑکے نے ٹیلے پر چڑھ کر شور مچایا کہ ''شیر آیا شیر آیا'' مگر کسی نے اس کی بات کی طرف توجہ نہ دی اور شیر اطمینان کے ساتھ اپنا کام کر گیا۔

میں پشاور کی رویت ہلال کمیٹی کے سامنے پیش کی جانے والی شہادتوں اور ذمہ دار علمائے کرام کے فیصلے پر کسی شک کا اظہار نہیں کر رہا۔ یقیناً یہ شہادتیں پیش ہوئی ہیں اور ان کی بنیاد پر فیصلہ کرنے والے علمائے کرام کی نیک نیتی اور سنجیدگی بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے، مگر اس سوال کا جواب خود انھیں تلاش کرنا چاہیے کہ ان کے اس اعلان کو باقی ملک میں آخر کیوں قبول نہیں کیا گیا اور سینکڑوں شہادتوں اور اس قدر اہتمام کے باوجود ان کے فیصلے کو ایک بار پھر یہ کہہ کر کیوں ٹال دیا گیا ہے کہ ''چھوڑ جی! پشاور والے تو پہلے بھی اسی طرح کرتے ہیں۔'' باقی رہی بات مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئر مین اور ارکان کے درمیان اختلاف وتنازع کی تو اس کا حل آج بھی صرف یہ ہے کہ انھیں بٹھا کر باہمی اتفاق سے اختلاف کو دور کرا دیا جائے اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو موجودہ کمیٹی کو توڑ کر نئی کمیٹی تشکیل دی جائے، کیونکہ موجودہ صورت میں یہ کمیٹی آئندہ بھی قوم کو کوئی متفقہ فیصلہ نہیں دے سکے گی۔

(روزنامہ پاکستان، ۴؍ دسمبر ۲۰۰۳)

رویت ہلال کا مسئلہ!

رویت ہلال کا مسئلہ اس بار پھر تنازع کی صورت اختیار کیے ہوئے ہے، اور اس کی بازگشت سپریم کورٹ کے ایوانوں میں بھی سنائی دینے لگی ہے، ۲۳ ستمبر (۲۹ شعبان) کو مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئر مین مولانا مفتی منیب الرحمٰن نے اعلان کیا کہ ملک کے کسی بھی حصے سے چاند دیکھے جانے کی شہادت موصول نہیں ہوئی، اس لیے مرکزی رویت ہلال کمیٹی نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے کہ یکم رمضان المبارک ۲۵ ستمبر کو پیر کے روز ہوگی، جب کہ صوبہ سرحد کے وزیر مذہبی امور مولانا امان اللہ حقانی کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے پشاور میں علماء کے سامنے چاند دیکھنے جانے کی شہادتیں پیش کی گئی ہیں، جن کی بنیاد پر انہوں نے ۲۴ ستمبر اتوار کو یکم رمضان المبارک قرار دینے کا اعلان کیا اور اسی روز پہلا روزہ رکھا، چنانچہ ان دو اعلانات کے حوالے سے صورت حال یہ ہے کہ ملک کے بیشتر حصوں میں رمضان المبارک کا آغاز پیر سے ہوا، مگر صوبہ سرحد کے بعض حصوں میں اس سے ایک دن قبل اتوار سے رمضان المبارک شروع ہو گیا تھا، اب جوں جوں عید الفطر نزدیک آ رہی ہے، یہ مسئلہ دوبارہ بحث ومباحثہ کا موضوع بن رہا ہے، اور صوبہ سرحد سے بھی اس کے بارے میں دو مختلف ردعمل سامنے آ چکے ہیں، مردان کے ایک خطیب مولانا محمد خان صاحب نے سپریم کورٹ آف پاکستان میں درخواست دائر کی ہے کہ چونکہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی ایک آئینی ادارہ ہے اس لیے عدالت عظمیٰ اس کے فیصلوں پر عمل درآمد کو لازمی قرار دے اور اس کے بغیر کسی ادارے کی طرف سے رویت ہلال کے اعلان کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ مگر سپریم کورٹ آف پاکستان کے پشاور کے بنچ نے

جو جسٹس سردار محمد رضا خان اور جسٹس ناصر الملک پر مشتمل ہے، یہ کہہ کر اس درخواست کو نامنظور کر دیا ہے کہ عوام کی مرضی ہے کہ وہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے اعلان پر عمل کریں، یا رویت ہلال کے سلسلے میں کسی پرائیویٹ کمیٹی کے اعلان کو قبول کریں، اس لیے اس سلسلے میں کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔

دوسری طرف صوبہ سرحد کی قدیمی دارالافتا نجم المدارس کلاچی ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے کہ روزے، اعتکاف اور عید کے سلسلے میں مرکزی رویت ہلال کمیٹی کا اعلان ہی معتبر ہے اور چونکہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی تمام مسالک کے جید علمائے کرام پر مشتمل ہے، اس لیے اس سلسلے میں اسی کے اعلان کو قبول کیا جانا چاہیے اور سب کو اسی پر عمل کرنا چاہیے۔ پشاور اور بعض دیگر علاقوں میں اس سے قبل بھی باقی ممالک سے ایک روز قبل روزہ رکھنے اور ایک روز قبل عید کرنے کی روایت چلی آ رہی ہے، اور ایسا کرنا کئی بار ہو چکا ہے، لیکن اس بار صوبہ سرحد کی حکومت کے اس سلسلے میں خود فریق بننے، سپریم کورٹ میں اس مسئلے کے اٹھائے جانے اور ایک اہم دارالافتا کی طرف سے اس مسئلے پر واضح اظہار رائے کے بعد اس بحث نے نئی صورت اختیار کر لی ہے، اور بہت سے سوالات کھڑے کر دیے ہیں، جن پر اہل علم کو توجہ دینی چاہیے، اور قوم کی راہنمائی کرنی چاہیے ، ان میں سے ایک دو سوالات کا ذکر کیا جا رہا ہے، جہاں مرکزی رویت ہلال کمیٹی کا تعلق ہے اس کا پس منظر یہ ہے کہ صدر محمد ایوب خان کے دور تک صورت حال یہ تھی کہ اگرچہ سرکاری طور پر چاند نظر آنے یا نہ آنے کا اعلان کیا جاتا تھا، لیکن چونکہ اس کا نظم صرف سرکاری ہوتا تھا، اس لیے عام طور پر اس کا اعتبار نہیں کیا جاتا تھا اور ہر علاقے میں علماء کرام اپنے طور پر چاند دیکھنے کا اہتمام کر کے اس کے مطابق فیصلے کرتے تھے، اس صورت میں اکثر ایسے ہو جاتا تھا کہ ایک شہر میں عید ہو رہی ہے مگر اس سے تھوڑے فاصلے پر دوسرے شہر میں عید نہیں ہے۔ یہ بھی ہوتا تھا کہ ایک مسلک کے لوگ روزے رکھے ہوئے ہیں مگر دوسرے مسلک کے لوگوں کی عید ہے، یہ بھی ہوتا تھا کہ ایک شہر کے کچھ لوگ عید منا رہے ہیں اور اسی شہر کے باقی لوگوں کا روزہ ہے، بلکہ ایک بار گوجرانوالہ میں ایسا بھی ہوا ہے کہ خود ہمارے دیوبندی مسلک کے بعض علمائے کرام نے عید کی اور ہمارے مسلک کے دوسرے

علماعوام کوروزہ رکھوائے ہوئے تھے، یہ صورت حال پریشان کن ہوگئی تھی، اور ہرطرف افراتفری کی کیفیت ہوجایا کرتی تھی، اس کے ساتھ ہی روزے یا عید کے سرکاری اعلانات سے اختلاف کی پاداش میں بعض علمائے کرام کے خلاف کاروائی بھی ہوئی تھی، اور بدمزگی کی ایک اورشکل پیدا ہوجایا کرتی تھی، چنانچہ ایک سال عید کے سرکاری اعلانات سے اختلاف کی وجہ سے چار بڑے بڑے علمائے کرام ....(۱) مولانا غلام غوث ہزارویؒ (۲) مولانا احتشام الحق تھانویؒ (۳) مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ (۴) مولانا مفتی محمد حسین نعیمی گرفتار ہوئے اورکم وبیش ایک ماہ نظر بند رہے۔

اس دور میں روزے یا عید کا سرکاری اعلان تو متنازعہ سمجھا ہی جاتا تھا، مگر آپس میں بھی ایک دوسرے کے اعلانات پر اعتماد نہیں کیا جاتا تھا، اور ہرشہر اور ہرمسلک کے علمائے کرام چاند دیکھے جانے کے بارے میں خود اپنی تسلی ضرور تصور کرتے تھے، جس سے روزے یا عید کے حوالے سے ملک بھر میں خلفشار کی کیفیت پیدا ہوجایا کرتی تھی، اس پس منظر میں کچھ اصحاب فکر نے دونوں وجوہ کو سامنے رکھتے ہوئے مسئلے کا حل پیش کیا کہ روزے یا عید کا اعلان تو سرکاری طور پر ہی ہونا چاہیے، تاکہ باہمی خلفشار سے بچا جاسکے، لیکن یہ اعلان سرکاری اہل کاروں سے نہ ہو، بلکہ اسکے لیے تمام مکاتب فکر کے جید علمائے کرام کی ایک مشترکہ کمیٹی قائم کردی جائے جو چاند کے دیکھے یا نہ دیکھے جانے کا شرعی اصولوں کے مطابق فیصلے کرے اور اسکا اعلان بھی وہی کرے، لیکن اس کے اعلان کو سرکاری اعلان کی حیثیت حاصل ہوتا کہ اس پر ملک بھر میں یکساں طور پر عمل درآمد ہوسکے۔

مجھے یاد ہے کہ مسئلے اس حل کو عملی صورت میں لانے کے لیے حضرت مولانا مفتی محمودؒ سب سے زیادہ فکرمند تھے، انہی کی کوششوں سے مختلف مکاتب کے سرکردہ علمائے کرام پر مشتمل مرکزی رویت ہلال کمیٹی کا سرکاری طور پر قیام عمل میں لایا گیا تھا، اوراسکے بعد رفتہ رفتہ یہ صورت حال پیدا ہوگئی تھی کہ پشاور، مردان اور بعض دیگر علاقوں میں اگرچہ اس سے ہٹ کر فیصلہ کیا جاتا تھا اور اس پر عمل بھی ہوتا تھا، لیکن باقی پورے ملک میں مرکزی رویت ہلال کمیٹی پر اعتماد کرتے ہوئے اس کے مطابق روزے اور عید کے اہتمام متفقہ طور پر ہونے لگ گیا تھا، اس سے قبل ہمارے ہاں پشاور کی مسجد قاسم علی خان کی طرح گوجرانوالہ میں مرکزی جامع مسجد اس سلسلے میں سرگرمیوں کا مرکز ہوا تھی

،اور روزے یا عید کا چاند دیکھنے اور اس سلسلے میں شہادتیں لے کر فیصلہ کرنے کے لیے علمائے کرام ،استاد العلماء حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ کے پاس جمع ہو جایا کرتے تھے، بسا اوقات ساری ساری رات بحث ومباحثہ میں گزر جایا کرتی تھی، اور فیصلہ نہیں ہو پا تا تھا، لیکن مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے قیام کے بعد یہ سلسلہ موقوف ہو گیا۔

میں نے ایک سال ایسے ہی موقع پر حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ سے عرض کیا کہ کیا حسب سابق علمائے کرام سے رابطے کیے جائیں؟ تو انہوں نے فرمایا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں، اب ہم مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے فیصلے پر ہی عمل کریں گے، چنانچہ اس کے بعد ایسا ہو رہا ہے کہ الگ طور پر چاند دیکھنے یا اس کے بارے میں فیصلے کرنے کی قدیمی روایت ترک ہو گئی۔ مرکزی رویت ہلال کمیٹی جو بھی فیصلہ کرے، ہم اس پر عمل کرتے ہیں اور کم وبیش پورے ملک میں مذکورہ بالا استثناء کے ساتھ اب صورت حال یہی ہے، میرے خیال میں اس مسئلے میں خلفشار کی نئی صورت صوبہ سرحد میں ایم ایم اے کی حکومت کے اس سلسلے میں فریق بننے سے رونما ہوتی ہے۔، ورنہ پشاور، مردان ،اور دیگر بعض قبائلی علاقوں میں ہر سال الگ سے روزہ اور عید کا فیصلہ کیے جانے کے باوجود ملک بھر میں روزہ اور عید کے سلسلے میں اتفاق صورت پیدا ہو گئی تھی ،اور بعض علاقوں کے اختلافات کو ان کا ''تفرد'' سمجھ کر گوارا کر لیا گیا تھا، لیکن متحدہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت نے چاند کے مسئلے پر فریق بن کر اس ''تفرد'' کو باقاعدہ ''تنازع'' کی شکل دے دی ہے۔

یہاں دو سوالات غور طلب ہیں، جن کی طرف اہل علم کو توجہ دلا رہا ہوں ایک یہ کہ خود علمائے کرام اور دینی جماعتوں کی مرضی کے مطابق مرکزی سطح پر جید علمائے کرام پر مشتمل رویت ہلال کمیٹی کی تشکیل کے بعد کسی شہر میں الگ طور پر رویت ہلال کے اہتمام کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے ؟اور اگر اس الگ اہتمام کی صورت میں عوام کی خلفشار پیدا ہوتا ہو کیا ایسے الگ اہتمام کو باقی رکھنے کا کوئی جواز ہے؟ اور دوسرا یہ کہ جب مرکزی سطح پر چاند کا اعلان حکومت نہیں بلکہ جید علمائے کرام کی کمیٹی کرتی ہے اور اسے ہی سرکاری اعلان تصور کیا جاتا ہے تو کیا صوبہ سرحد کی حکومت کا اس میں فریق بن کر اپنی طرف سے فیصلے اور اہتمام کرنا درست ہے،؟ فقہ اسلامی کے ایک طالب علم کے

طور پر مجھے ان دونوں باتوں سے اختلاف ہے میں انہیں درست نہیں سمجھتا اور اسی وجہ سے سپریم کورٹ آف پاکستان کے پشاور بنچ کے دو معزز ججوں کے ریمارکس کے بارے میں تحفظات رکھتے ہوئے نجم المدارس کلاچی کے فتوی کو درست تصور کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں اور بھی بہت سے سوالات ہیں اور اگر کسی صاحب علم نے سنجیدگی کے ساتھ اس طرف توجہ دی تو ان کے بارے میں بھی کچھ معروضات پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔ ان شاء اللہ تعالی۔

(روزنامہ پاکستان، ۲۲/اکتوبر ۲۰۰۶ء)

پاکستان کے نظریاتی تشخص کے تناظر میں
قومی ایشوز میں ایم ایم اے کا کردار

ایمل کانسی شہید.........قوم کا ہیرو

جمعیت علماے اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمٰن نے میر ایمل کانسی شہید کے گھر جا کر اوراس کے خاندان سے تعزیت کر کے پورے ملک کے علماے کرام اور دینی حلقوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے، ورنہ یہ ملک کے ہر عالم دین اور دینی کارکن کے ذمے تھا کہ وہ میر ایمل کانسی شہید کے گھر جا کر اس خاندان سے تعزیت کرتا اور ایمل کانسیؒ کے بھائیوں کو یقین دلاتا کہ ان کے دلیر اور جرات مند بھائی نے جس حوصلے اور استقامت کے ساتھ قومی خودمختاری اور ملک کی آبرو کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا ہے، اس پر قوم کا ہر باغیرت شخص فخر کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ ایمل کانسیؒ نے جھکنے اور کمزوری دکھانے کے بجائے آبرومندانہ طریقے سے جام شہادت نوش کر کے نہ صرف پاکستانی عوام کو ایک نئے حوصلے سے نوازا ہے بلکہ امریکی استعمار کو بھی یہ پیغام دیا ہے کہ پاکستان کے غیرت مند نوجوان اس کے جبر وتشدد کے ہتھکنڈوں سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ اپنے دین کی سربلندی، ملک کی سالمیت اور قوم کی خودمختاری کے لیے پہلے سے زیادہ عزم اور جذبے سے سرشار ہیں۔

ایمل کانسی کو میاں نواز شریف حکومت کے دور میں ڈیرہ غازی خان کے ایک ہوٹل سے اغوا کر کے امریکہ کے حوالے کر دیا گیا تھا جہاں اس پر اس الزام میں مقدمہ چلا کہ اس نے چند سال قبل امریکہ میں قیام کے دوران سی آئی اے کے دو اہل کاروں کو قتل کر دیا تھا۔ اس الزام میں اس پر مقدمہ چلا اور اسے موت کی سزا سنا دی گئی۔ اخباری رپورٹوں کے مطابق موت کی سزا سے پہلے ایمل کانسیؒ

نے قرآن مجید کی تلاوت کی اور آخر میں کلمہ طیبہ زبان سے دہرایا جس کے بعد زہر کا ٹیکہ لگا کر اسے موت کی نیند سلا دیا گیا۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون)

اخباری رپورٹوں کے مطابق سزائے موت سے قبل اپنے آخری انٹرویو میں میر ایمل کانسی شہید نے کہا کہ اس نے جو کچھ کیا، وہ ان امریکی مظالم کا ردعمل تھا جو امریکہ پورے عالم اسلام بالخصوص فلسطین میں جاری رکھے ہوئے ہے اور امریکی سی آئی اے مسلمانوں کے قتل عام میں مصروف ہے، اس لیے وہ یہ سمجھتا ہے کہ ظالموں کے ظلم و جبر کے ردعمل میں ہتھیار اٹھانے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس نے جو کچھ کیا ہے، اس پر اسے کوئی ندامت نہیں ہے۔

میر ایمل کانسی نے امریکی سی آئی اے کے اہل کاروں کو کس مقصد سے قتل کیا تھا اور اس کا پس منظر کیا تھا؟ یہ بات واضح نہیں ہے، لیکن شہید کے انٹرویو سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ امریکہ کے اسلام دشمن طرز عمل اور پالیسیوں کے خلاف عالم اسلام میں ابھرنے والے ردعمل کا حصہ ہے اور اس کے قلب و ذہن میں وہی جذبات و خیالات کارفرما رہے ہیں جو عالم اسلام کے مختلف حصوں میں امریکی پالیسیوں کے خلاف مسلمانوں کی غیرت و حمیت کے اظہار کا عنوان بن گئے ہیں۔

میر ایمل کانسی شہید کو جس انداز سے ڈیرہ غازی خان سے گرفتار کیا گیا، وہ اپنی جگہ خود ایک مسئلہ ہے اور اس پر پاکستان کے قومی اور دینی حلقوں کی طرف سے جن جذبات کا اظہار کیا گیا، اس کا مکمل ترین اظہار قومی اسمبلی میں اس وقت سامنے آیا جب بلوچستان سے قومی اسمبلی کے رکن حافظ حسین احمد نے میر ایمل کانسی شہید کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہوئے اپنی دعا میں یہ جملے شامل کیے کہ ''یا اللہ! ایمل کانسی کو امریکہ کے حوالے کرنے والوں کا بیڑہ غرق فرما۔''

یہ الفاظ حافظ حسین احمد کے تھے اور اس کے پیچھے پوری قوم کے جذبات تھے، اس لیے امریکہ پر یہ بات اب پوری طرح واضح ہو جانی چاہیے کہ عالم اسلام میں امریکی پالیسیوں کے خلاف مسلم نوجوانوں کے جائز اور فطری ردعمل کو جبر کے ذریعے دبانے اور تشدد کے ذریعے باغیرت مسلمانوں کے منہ بند کرنے کے سارے حربے ناکام ہو گئے ہیں اور یہ حربے تاریخ کے کسی بھی دور میں کامیاب نہیں ہوئے۔ زندہ قوموں کو ان کے ایمان و عقیدہ، آزادی و خودمختاری اور جذبات و احساسات سے

نہ اس سے قبل کبھی طاقت اور جبر کے ذریعے محروم کیا جا سکا ہے اور نہ اب کسی طاقت کے ذریعے کرنا ممکن ہے۔ امریکہ کو اسی سے اندازہ کر لینا چاہیے کہ جس شخص کو اس نے مجرم قرار دیا اور اپنے قانونی نظام کے تحت مجرم ثابت کر دیا اور عدالتی سسٹم کے ذریعے اسے موت کی سزا دلوا دی، سزا یافتہ قاتل جب تدفین کے لیے اپنے وطن پہنچا تو وہ قوم کا ہیرو قرار پایا ہے، قومی اسمبلی میں اس کے لیے دعائے مغفرت ہوئی ہے، بلوچستان کے گورنر نے اس کے گھر جا کر اس کے خاندان سے تعزیت کی، لاکھوں مسلمانوں نے اس کی میت کا استقبال کیا اور کم و بیش قوم کے ہر طبقے کی طرف سے اس کی سزائے موت کے خلاف غم و غصے کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس سے امریکی حکومت کو اپنے عدالتی نظام کے حوالے سے بھی مسلمانوں کے جذبات کا اندازہ ہو جانا چاہیے کہ امریکی عدالتی سسٹم، جسے دنیا بھر میں آئیڈیل اور مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، امریکی جبر و تشدد کا شکار ہونے والے ملکوں اور قوموں کے نزدیک اس قانونی نظام کی حیثیت کیا ہے؟

ایمل کانسی کو امریکہ کے سپرد کرنے کے بارے میں اس دور کے صدر سردار فاروق خان لغاری اور وزیر اعظم میاں نواز شریف دونوں کی طرف سے لاعلمی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ عذر گناہ بدتر از گناہ کے مترادف ہے، کیونکہ اگر ڈیرہ غازی خان کے ہوٹل سے ایمل کانسی کا اغوا اور اسے امریکہ کے حوالے کرنے کی کارروائی سردار فاروق احمد خان لغاری اور میاں نواز شریف کے علم میں تھی اور ملک کی دو مقتدر شخصیات کی طرف سے قومی خود مختاری اور ملکی وقار کو داؤ پر لگانے کی بات تھی اور..........

مولانا فضل الرحمٰن اور پاکستان میں مسیحی ریاست

مولانا فضل الرحمٰن سے کافی عرصہ کے بعد گزشتہ روز جمعرات کو اسلام آباد میں ملاقات ہوئی اور مختلف امور پر تبادلہ خیالات کا موقع ملا۔ بدھ کی رات ٹیکسلا میں حضرت مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی آف اٹک کے حلقہ مریدین کا اجتماع ہوا تھا جس میں مجھے بھی شرکت اور کچھ معروضات پیش کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ پاکستان شریعت کونسل کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات مولانا صلاح الدین فاروقی اس اجتماع کے منتظم تھے جو حضرت مولانا قاضی زاہد الحسینی کے خصوصی تربیت یافتہ حضرات میں سے ہیں اور انہی کے رنگ میں علاقہ میں دینی وروحانی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

ٹیکسلا سے واپسی پر اسلام آباد میں ایک دو کاموں کے لیے رکا تو معلوم ہوا کہ مولانا فضل الرحمٰن اسلام آباد میں ہیں اور حافظ حسین احمد صاحب بھی ان کے پاس ہیں۔فون پر رابطہ قائم کر کے گوجرانوالہ کے معروف دینی وسماجی رہنما عثمان عمر ہاشمی صاحب کے ہمراہ مولانا فضل الرحمٰن کی قیام گاہ پر پہنچا تو سب سے پہلے اس روح فرسا خبر کا سامنا کرنا پڑا کہ حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی کو ابھی تھوڑی دیر پہلے کراچی میں ان کے ایک ساتھی کے ہمراہ شہید کر دیا گیا ہے جبکہ ان کا بیٹا اور ایک اور صاحب زخمی ہو گئے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ خبر اس قدر اندوہناک تھی کہ جمعیت علمائے آزاد جموں وکشمیر کے سیکرٹری جنرل مولانا قاری محمد نذیر فاروقی نے جب وہاں بیٹھے اس خبر سے آگاہ کیا تو کچھ دیر تک انا للہ وانا الیہ راجعون کے بے ساختہ ورد کے سوا کوئی بات سوجھ ہی نہیں رہی تھی۔تھوڑی دیر کے بعد مولانا فضل الرحمٰن کا کراچی فون پر رابطہ ہوا تو تفصیلات کا پتہ چلا کہ علم

وفضل کا یہ پہاڑ، خلوص وایثار کا یہ پیکر اور جہد واستقامت کا یہ عنوان کس طرح درندہ صفت اور سفاک دہشت گردوں کی گولیوں کا نشانہ بن کر اپنے مشن پر قربان ہو گیا ہے۔ مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کی علمی ودینی خدمات کا تذکرہ اس محفل کی ایک فطری بات تھی اور ہر دوست نے اپنے اپنے ذوق اور معلومات کے مطابق حضرت مولانا مرحوم کی خدمات اور جدوجہد کا تذکرہ کیا اور ان کے وحشیانہ قتل پر افسوس اور صدمہ کا اظہار کیا۔

مولانا فضل الرحمٰن کے ساتھ میری یہ ملاقات کافی عرصہ کے بعد ہوئی تھی، اس لیے بہت سے مسائل میرے ذہن میں تھے اور بہت سے امور ان کے دائرہ خیال میں بھی تھے جن پر ہم گفتگو کرنا چاہ رہے تھے، مگر اس نئی صورت حال کے پیش نظر ایک دو مسئلوں کے سوا گفتگو نہ ہو سکی اور بات آئندہ کسی ملاقات پر جا پڑی۔

مولانا فضل الرحمٰن کو مجھ سے ایک شکایت تھی جس کا انہوں نے ہلکے پھلکے انداز میں ذکر کیا کہ میں جمعیت علمائے اسلام کا کام نہیں کر رہا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ میں جو کام کر رہا ہوں، وہ بھی پروگرام اور مشن کے حوالے سے جمعیت علمائے اسلام ہی کا کام ہے، البتہ انداز قدرے مختلف ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن نے میرے اس جواب کا کوئی جواب نہ دیا مگر میرے رفیق سفر عثمان عمر ہاشمی صاحب واپسی پر میرے ساتھ دیر تک خاصی بحث کرتے رہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس وقت بھی جمعیت علمائے اسلام کا باضابطہ رکن ہوں مگر گروہ بندی کے ماحول میں کوئی متحرک کردار ادا کرنے کے لیے ذہنی طور پر خود کو تیار نہیں پاتا۔ ایک دور میں جماعتی گروہ بندی کے حوالے سے خاصا متحرک رہا ہوں، مگر آٹھ دس سال پہلے اس کام سے طبیعت ایسی اکتائی ہے کہ اب جماعتی گروہ بندی کے نام پر ایک تنکا توڑنے کو بھی جی نہیں چاہتا، اس لیے اس کے بعد سے بطور پالیسی یہ بات طے کر لی ہے کہ جمعیت علمائے اسلام کا کوئی دھڑا ہو، جہادی تحریکات کے مختلف گروپ ہوں یا دینی جماعتوں کے الگ الگ پلیٹ فارم ہوں، دینی مقاصد کے حوالہ سے جس فورم سے بھی خیر کا کوئی کام ہو رہا ہے، اس سے حتی الوسع تعاون کیا جائے اور باہمی گروہ بندی میں کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف فریق کی حیثیت اختیار نہ کی جائے۔ البتہ جمعیت علمائے اسلام میرا اپنا گھر ہے، اس لیے اگر اس کے مختلف

گروپوں میں اتحاد کی کوئی صورت بن جائے تو اس کی خوشی سب سے زیادہ مجھے ہوگی اور نہ صرف میں بلکہ پوری پاکستان شریعت کونسل اس اتحاد میں ضم ہونے اور ہم میں سے ہر شخص اپنی اپنی بساط کے مطابق متحرک کردار ادا کرنے کو اپنے لیے باعث سعادت تصور کرے گا۔

مولانا فضل الرحمٰن سے امریکی عزائم کے خلاف ان کی جرات مندانہ مہم اور این جی اوز کے بارے میں ان کی مسلسل سرگرمیوں پر بھی بات چیت ہوئی اور راقم الحروف نے ان سے عرض کیا کہ انہوں نے بلاشبہ وقت کی نبض پر ہاتھ رکھا ہے، اس دور کی اہم ترین دینی وملی ضرورت کو بروقت محسوس کیا ہے اور اسے پورا کرنے کے لیے جرات واستقلال اور حوصلہ واستقامت کی اسی عظیم روایت کو اختیار ہے جو ہمارے اسلاف واکابر کا وطیرہ رہی ہے، اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ تاریخ میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کی جدوجہد کے تسلسل میں خلا اور تعطل کا جو خطرہ میرے جیسے نظریاتی کارکنوں کو نظر آنے لگا تھا، وہ ٹل گیا ہے۔ مجھے یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ این جی اوز کے بارے میں مولانا فضل الرحمٰن اور ان کی قیادت میں جمعیت علماء اسلام کی جدوجہد جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے، اسی رفتار سے این جی اوز کی سرگرمیوں کے حوالے سے ان کے ادراک، معلومات، تجربہ اور احساس میں بھی اضافہ ہو رہا ہے اور این جی اوز کے ساتھ مسیحی مشنریوں کی سرگرمیاں بھی ان کے دائرہ ادراک اور احساس میں اپنی جگہ بناتی جا رہی ہیں۔ چنانچہ مولانا فضل الرحمٰن نے حال ہی میں فیصل آباد میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے پاکستان میں مسیحی ریاست کے قیام کے جس مبینہ امریکی منصوبے کا ذکر کیا ہے، وہ بھی قوم کے لیے ایک بروقت انتباہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

راقم الحروف تو ایک عرصہ سے اپنے محدود دائرہ میں اور نہ ہونے کے برابر وسائل کے ساتھ اس ایجنڈے پر کام کر رہا ہے اور اس سلسلے میں ۹۸ء میں این جی اوز اور مسیحی مشنریوں کی سرگرمیوں اور طریق کار کے بارے میں منتخب رپورٹوں کا ایک مجموعہ ''الشریعہ'' کی خصوصی اشاعت کے طور پر پیش کیا جا چکا ہے۔ اس ضمن میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ پاکستان کو بتدریج مسیحی ریاست بنانے یا پاکستان کے اندر ایک مسیحی ریاست قائم کرنے کے مجوزہ منصوبوں کا تذکرہ مختلف رپورٹوں میں ملتا ہے جو بظاہر ایک ناممکن سی بات لگتی ہے، مگر آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑے مسلمان ملک

انڈونیشیا میں جس طرح عالمی دباؤ کے تحت ''مشرقی تیمور'' کو الگ مسیحی ریاست کی حیثیت دی جا چکی ہے اور اس کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ملک کے مختلف حصوں میں خالص مسیحی کالونیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، چنانچہ روزنامہ نوائے وقت کے ایک ادارتی شذرہ کے مطابق سینکڑوں مسیحی نوجوان مسلمان ناموں کے ساتھ مختلف جہادی گروپوں میں شامل ہو کر عسکری تربیت حاصل کر چکے ہیں اور ملک کے ہر حصے میں این جی اوز اور مسیحی مشنریوں کی سرگرمیاں روز بروز اضافہ پذیر ہیں، تو اس پس منظر میں مختلف صحافتی رپورٹوں میں پاکستان کو مسیحی ریاست بنانے کے منصوبوں کے تذکرہ اور مولانا فضل الرحمٰن کے مذکورہ انتباہ کو بلاوجہ قرار دینا مشکل ہے۔

بہرحال مولانا فضل الرحمٰن کے ساتھ ملاقات خاصی سودمند رہی اور یہ حوصلہ ملا کہ اہل حق کا گروہ دینی فرائض اور ملی مقاصد کے لیے جدوجہد کے حوالے سے سست رفتاری اور خلفشار کا شکار ہونے کے باوجود اپنے عزائم اور اہداف سے غافل نہیں ہے، اور اگر ٹارگٹ نظر سے اوجھل نہ ہو تو سست روی اور خلفشار کے کانٹے دامن سے الجھتے ضرور ہیں مگر سفر کا راستہ بدلنے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔

(روزنامہ؟؟؟، ۲۶ مئی ۲۰۰۰)

پاسپورٹ مسئلہ پر جمعیت علماء اسلام کی آل پارٹیز کانفرنس

جمعیت علماء اسلام پاکستان کے سربراہ مولانا فضل الرحمٰن نے ۱۸ر دسمبر ہفتہ کو اسلام آباد میں آل پارٹیز ختم نبوت کانفرنس طلب کر لی جس کا مقصد پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ ختم کرنے کے بارے میں حکومتی کاروائی کا جائزہ لینا ہے اور دینی حلقوں کے اس مطالبہ کی حمایت کرنا ہے کہ حسب سابق پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ بحال کیا جائے۔ مولانا موصوف نے مختلف جماعتوں کے رہنماؤں کو اس سلسلہ میں جو دعوت نامہ جاری کیا ہے اس کا متن یہ ہے:

''مسئلہ ختم نبوت کے تحفظ کے لیے منکرین ختم نبوت (قادیانیوں) کو آئین پاکستان میں متفقہ طور پر پارلیمنٹ نے غیر مسلم اقلیت قرار دیا اس کے قانونی تقاضہ کی تکمیل اور حرمین شریفین میں قادیانیوں کا داخلہ روکنے کے لیے پاسپورٹ میں مذہب کا خانے کا اضافہ کیا گیا۔ ۲۵ سال سے یہ خانہ پاسپورٹ میں موجود تھا اب حکومت نے نئے کمپیوٹر ائزد پاسپورٹ سے اسے حذف کر دیا جو اسلامیاں پاکستان کے لیے سخت پریشانی کا باعث ہے۔ اس پر ملک بھر میں شدید احتجاج جاری ہے لیکن تا حال حکومت نے اصلاح احوال کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اس حساس دینی و قومی مسئلہ پر سوچ و بچار اور لائحہ عمل طے کرنے کے لیے جمعیت علماء اسلام نے تمام مکاتب فکر کی آل پارٹیز ختم نبوت کانفرنس ۱۸ر دسمبر کو طلب کرنے کا فیصلہ کیا ہے''۔

پاسپورٹ میں مذہب کے خانہ کے حوالہ سے کافی دنوں سے دینی و قومی میں بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری ہے اور اس بات پر تعجب کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ پاسپورٹ میں مذہب کا یہ خانہ جو

تحریک ختم نبوت کے ایک طویل دور کے بعد دینی حلقوں کے مسلسل مطالبہ اور عوامی دباؤ پر پارلیمنٹ کے متفقہ فیصلہ کے منطقی تقاضوں کی تکمیل کے لیے آج سے پچیس برس قبل پاسپورٹ میں شامل کیا گیا تھا اسے ختم کرنے کے لیے اس قدر خاموشی سے کاروائی کی گئی ہے کہ نہ تو پارلیمنٹ کو اعتماد میں لینے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے اور نہ ہی ان حلقوں کو اس سلسلہ میں کچھ بتانے کی زحمت گوارہ کی گئی ہے۔جن کی جدوجہد کے نتیجے میں یہ خانہ پاسپورٹ کے اندراجات کا حصہ بنا تھا۔اس لیے ملک کے دینی حلقے یہ اندازہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ کوئی مخصوص لابی اندر ہی اندر ملک کی اسٹیبلشمنٹ میں اس مقصد کے لیے متحرک ہے جو قادیانیوں کے بارے میں پارلیمنٹ کے فیصلے کو غیر موثر بنانے کے لیے جب بھی کوئی موقع ملتا ہے خاموشی کے ساتھ دکھا جاتی ہے۔

اس سے قبل جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور حکومت میں ایسا ہوا تھا کہ مسلم ووٹروں کے فارم میں عقیدہ ختم نبوت کا حلف نامہ اچانک ختم کر دیا گیا جس کا فائدہ صرف قادیانیوں کو تھا کہ وہ اپنے نام مسلم ووٹروں کی فہرست میں درج کرا کے اپنے بارے میں پارلیمنٹ کے فیصلے کو غیر موثر بنا سکتے تھے،صورتحال معلوم ہونے پر جب دینی حلقوں نے احتجاج کیا تو کہا گیا کہ اب تو لاکھوں فارم شائع ہو چکے ہیں اور دوبارہ فارم چھپوانے میں وقت اور رقم دونوں کا ضیاع ہوگا اس وقت پاکستان قومی اتحاد کے سربراہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے اس مسئلہ کو ہاتھ میں لیا اور جنرل ضیاء الحق سے دوٹوک طور پر کہہ دیا کہ ہم الیکشن کے التواء سمیت ہر بات قبول کرنے کو تیار ہیں مگر عقیدہ ختم نبوت کے حلف نامہ کے بغیر ووٹر فارم کسی صورت میں قبول نہیں ہوں گے جس پر حکومت کو دوبارہ یہ حلف نامہ ووٹر فارم میں شامل کرنا پڑا۔

چند سال قبل ایک بار پھر یہ ڈرامہ دہرایا گیا اور ''ووٹر فارم سے عقیدہ ختم نبوت کا حلف نامہ خاموشی سے غائب کر دیا گیا جس پر دینی حلقے ایک بار پھر سراپا احتجاج ہوئے جمعیۃ علماء اسلام کے قائد مولانا فضل الرحمٰن نے لاہور میں آل پارٹیز ختم نبوت کانفرنس طلب کی جس پر حکومت کو اپنا یہ اقدام واپس لینا پڑا۔

اب یہ کھیل پاسپورٹ کے ساتھ کھیلا گیا اور انتہائی خاموشی کے ساتھ اسلام آباد سے جاری

ہونے والے نئے مشینی ریڈ ایبل کمپیوٹرائزڈ پاسپورٹ سے مذہب کا خانہ نکال دیا گیا۔ یہ کاروائی اس طرح منظم انداز میں کی گئی کہ اس کا پتہ اس وقت چلا جب ہزاروں پاسپورٹ جاری ہو چکے تھے اور پاسپورٹ کی لاکھوں کاپیاں طبع ہو چکی تھیں۔ چنانچہ جب اس سلسلہ میں رابطہ کیا گیا تو وہی عذر دہرایا گیا کہ اب تو کچھ نہیں ہوسکتا، لاکھوں کاپیاں چھپ چکی ہیں اور بین الاقوامی معیار کے مطابق ریڈ ایبل سسٹم مذہب کے خانوں کو قبول نہیں کرتا اس لیے کمپیوٹر کے اندراج میں مذہب کا خانہ شامل نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ الگ سے پاسپورٹ پر یہ مہر لگائی جاسکتی ہے کہ ''حامل ھذا مسلمان ہے'' مگر یہ عذر عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

اس حوالہ سے حکومت کا جو موقف سامنے آیا ہے اور وفاقی وزراء نے ایوان میں اس کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کی روشنی میں دو تین سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔ ایک یہ کہ پاسپورٹ کے مذہب کے خانہ کے خاتمہ کی خاموش کاروائی کس کے حکم سے کی گئی ہے؟ اگر یہ خود حکومت کا فیصلہ ہے تو اس نے اس سلسلہ میں قومی اسمبلی اور متعلقہ فریقوں کو اعتماد میں کیوں نہیں لیا اور اگر افسر شاہی کی کسی لابی نے از خود اتنی بڑی کاروائی کر دی ہے تو اس کے ذمہ دار افراد کے خلاف کیا ایکشن لیا گیا ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ بین الاقوامی سسٹم پاسپورٹ کے خانہ میں مذہب کے خانے کو قبول نہیں کر رہا اور اسے نارمل کاروائی کے طور پر قبول کر لیا گیا ہے تو کل اگر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ساتھ ''اسلامی'' کے لفظ کو قبول کرنے سے بین الاقوامی سسٹم نے ہچکچاہٹ سے کام لینا شروع کر دیا تو کیا ہماری حکومت کا اس پر بھی یہی ردعمل ہوگا؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ جب پاسپورٹ کے باقاعدہ اندراجات میں مذہب کا ذکر نہیں ہوگا اور صرف مہر لگائی جائے گی کہ ''حامل ھذا مسلمان ہے'' تو اگر کوئی شخص جعلی مہر لگا کر خود کو مسلمان ظاہر کرے تو اس کے اس فراد کو چیک کرنے کی کیا صورت ہوگی خصوصا اس حوالہ سے کہ قادیانیوں کی ایک عرصہ سے یہ کوشش چلی آرہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی حیلے بہانے سے خود کو سرکاری دستاویزات میں مسلمان ظاہر کریں تو ان کی اس کوشش کا توڑ کیا ہوگا؟

ادھر سعودی عرب کے ممتاز رہنما اور موتمر عالم اسلامی کے صدر ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف کے اس خط نے بھی پاکستان کے دینی حلقوں کے ''خدشہ کی تصدیق کردی ہے جو انہوں نے اس سلسلہ میں سعودی حکومت کو لکھا ہے اور'' آن لائن'' کی رپورٹ کے مطابق انہوں نے پاکستان کے پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ ختم کئے جانے پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے حرمین شریفین میں قادیانیوں کے داخلہ کی راہ ہموار ہوگئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ حرمین شریفین میں غیر مسلموں کا داخلہ ممنوع ہے مگر قادیانی گروہ کئی دفعہ چکمہ دے کر حرمین شریفین میں داخل ہونے کی کوشش کر چکا ہے، اس گروہ کے زیادہ تر لوگوں کا تعلق پاکستان سے ہے اور ان کو حرمین شریفین میں داخلے سے باز رکھنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ پاسپورٹ پر مذہب کا اندراج کیا جائے۔ ڈاکٹر عبداللہ نصیف کے اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں صرف پاکستان میں نہیں بلکہ سعودی عرب میں بھی تشویش پائی جاتی ہے اور اس کارروائی کے منفی اثرات وخطرات کو وہاں بھی پوری طرح محسوس کیا جارہا ہے اس پس منظر میں جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمٰن کی طلب کردہ آل پارٹیز ختم نبوت کانفرنس وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ہمیں امید ہے کہ تمام دینی جماعتیں اس میں پوری احساس ذمہ داری کے ساتھ شریک ہوں گی اور حسب سابق تمام دینی جماعتوں کا یہ مشترکہ فورم سرکاری حلقوں میں چھپی ہوئی قادیانی نواز لابی کی اس سازش کا سدِ باب کرنے میں بھی کامیاب ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(روزنامہ اسلام، ۱۵ر دسمبر ۲۰۰۴)

کیا پاک بھارت انضمام ممکن ہے؟

مولانا فضل الرحمٰن نے دورہ بھارت سے واپسی پر بعض اخبارات میں شائع ہونے والی ان خبروں کی تردید کی ہے کہ انہوں نے پاکستان اور بھارت کو دوبارہ متحد کرنے کے لیے گول میز کانفرنس کی کوئی تجویز پیش کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ ''اکھنڈ بھارت'' کے حامی نہیں ہیں اور نہ ہی اس سلسلہ میں انہوں نے کوئی بات کی ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن کی اس وضاحت کے بعد ہمارے خیال میں اس حوالہ سے گفتگو کو آگے بڑھانے کی گنجائش باقی نہیں رہی لیکن مسئلہ صرف مولانا فضل الرحمٰن کا نہیں بلکہ ان دنوں پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کم کرانے کے مشن پر جو لوگ ٹریک ٹو یا بیک چینل ڈپلومیسی پر کام کر رہے ہیں ان کی ایک بڑی تعداد اس قسم کی باتیں کہہ رہی ہے اور ملک کے بعض ذمہ دار اخبار نویس حضرات نے بھی اپنے کالموں میں اس بات کا اشارہ دیا ہے کہ پاکستان اور بھارت کے ''یورپی یونین'' طرز کے کسی مشترکہ نظام کا حصہ بننے کی افادیت کا جائزہ لینا چاہئے۔ جبکہ جنوبی ایشیا کے مستقبل کے نقشہ کے لیے سامنے آنے والی مختلف تجاویز میں یہ بات بھی شامل ہے کہ یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکا کی طرز پر یونائیٹڈ سٹیٹس آف انڈیا یا یورپی یونین کی طرز پر انڈین یونین کا کوئی ایسا نظام ضرور قائم ہو جانا چاہئے جس میں پاکستان اور بھارت دونوں شامل ہوں اور اس طرح دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی ختم کی جائے پاکستان اور بھارت کے درمیان تنازعات کو کسی نہ کسی طرح حل کر کے دونوں کو ایک نظم کا حصہ بنانے کے جو فوائد گنوائے جا رہے ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

☆ دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی کم ہوگی اور ایک دوسرے کے مقابلہ اور باہمی مسابقت کے ماحول میں دفاع پر جو بھاری اخراجات ہو رہے ہیں انہیں کم کر کے عوام کی ترقی کے لیے استعمال کیا جا سکے گا۔

☆ دونوں ملکوں کے درمیان مصالحت کی صورت میں ایٹمی قوت کی ضرورت نہیں رہے گی اور دونوں یا کم از کم پاکستان کو ایٹمی قوت سے دستبرداری پر مجبور کیا جا سکے گا۔

☆ پاک فوج کا سائز کم کیا جا سکے گا جس کا ایک عرصہ سے عالمی طاقتوں کی طرف سے مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

☆ ایک جداگانہ اور خود مختار نظریاتی اسلامی ریاست کی حیثیت سے پاکستان کسی نہ کسی وقت عالم اسلام کے اتحاد اور اس کی قیادت کے لیے جو کردار ادا کر سکتا ہے اس کا امکان کم ہو جائے گا۔

☆ سرحدات کا کنٹرول نرم پڑنے سے نہ صرف دونوں ملک ایک دوسرے کے ساتھ آزادانہ تجارت کر سکیں گے بلکہ ''فری ٹریڈ'' کے عنوان سے دنیا بھر کی تجارت پر اجارہ داری کے خواہش مند بڑے صنعتی ممالک کو ایک بہت بڑی آزاد منڈی میسر آ جائے گی۔

☆ چین کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ اور مستقبل میں ایک عالمی طاقت کے طور پر اس کے امکانی کردار کا راستہ روکنے کے لیے اس کے گرد حصار مکمل کیا جا سکے گا۔

یہ اور اس قسم کے اور ممکنہ فوائد ہیں جن کے پیش نظر پاکستان اور بھارت کو کسی نہ کسی مشترکہ نظم کا حصہ بنانے کی تجویز آ رہی ہے اور اس کا ماحول بنانے کے لیے سالہا سال سے بیک ڈور، بیک چینل اور ٹریک ڈپلومیسی کے ذریعہ مختلف شعبوں میں مسلسل کام ہو رہا ہے۔ اس میں تازہ تبدیلی صرف یہ ہوئی ہے کہ اس مہم میں مولانا فضل الرحمٰن اور جمعیت علماء اسلام بھی اب ایک اہم حصہ اور کردار بنتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ ہمارے نزدیک یونائیٹڈ سٹیٹس آف انڈیا یا انڈین یونین قسم کی یہ تجاویز دراصل جمعیت علماء ہند کے اس فارمولے کی صدا کی بازگشت ہیں جو قیام پاکستان سے قبل جمعیت علماء ہند نے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی قیادت میں پیش کیا تھا اور جس میں کہا گیا تھا کہ برصغیر کو پاکستان اور بھارت کے نام پر دو الگ الگ ریاستوں میں تقسیم کرنے کی بجائے ایک

کنفیڈریشن کے تحت صوبوں کو مکمل خودمختاری دے دی جائے اور دفاع، خارجہ پالیسی، مواصلات اور ایک دو اور ضروری شعبوں کے لیے کنفیڈریشن طرز کا مشترکہ نظام وضع کرلیا جائے۔ اس تجویز کو اس وقت مسترد کردیا گیا تھا۔ لیکن آج وہی بات پاکستان اور بھارت کے مستقبل کے حوالہ سے مختلف حلقوں کی تجاویز میں سامنے آرہی ہے مگر ہمارے لیے سوچنے کی بات ہے کہ کیا پاکستان کی جداگانہ خودمختار حیثیت اور اس کے اسلامی نظریاتی تشخص کو ختم کرنا یا کسی مشترکہ نظام کا حصہ بنا کر اسے کمزور کردینا آج کے حالات کے تناظر میں مسلمانوں کے مفاد میں ہوگا؟ ہمارے خیال میں ایسا نہیں ہے اور پاکستان کو اس کے نظریاتی تشخص اور عسکری وایٹمی صلاحیت سے محروم کرکے انڈیا کے ساتھ کسی نظم میں شریک کرنے کا مطلب جنوبی ایشیا پر بھارت کی بالادستی کو تسلیم کرلینے کے مترادف ہوگا جس کے بعد (خدانخواستہ) نہ صرف جنوبی ایشیا بلکہ وسطی ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے مسلمان بھی بھارت اور اسرائیل کے اس حصار میں آجائیں گے جسے امریکا اور یورپی یونین کی مکمل پشت پناہی حاصل ہوگی اور اس کے نتائج کا اندازہ کرنا کسی ذی شعور مسلمان اور پاکستانی کے لیے مشکل کام نہیں ہے۔

تاریخ یہ کہتی ہے کہ ہمارے جن بزرگوں نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی اور برصغیر کی تقسیم کو جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے مفاد کے خلاف قرار دیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ان بزرگوں نے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ اب پاکستان کی بقا اور استحکام میں ہی جنوبی ایشیا بلکہ پورے عالم اسلام کا مستقبل وابستہ ہے اور مسلمانوں کو اس نئے وطن کے استحکام اور سلامتی کے لیے محنت کرنی چاہئے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا وہ تاریخی خط حضرت مولانا زاہد الحسینیؒ آف اٹک کی کتاب ''چراغ محمدؐ'' میں موجود ہے جس میں حضرت مدنیؒ نے فرمایا تھا کہ پاکستان کے قیام سے ہمارے اختلاف کی نوعیت ایسی تھی جیسی کسی محلّہ میں مسجد بنانے کے لیے جگہ اور نقشے سے اختلاف ہوجائے ایک فریق الگ جگہ اور اپنے نقشے کے مطابق مسجد بنانے پر اصرار کررہا ہو اور دوسرا گروہ اس جگہ اور نقشہ سے اختلاف کررہا ہو لیکن جب ان میں سے کوئی فریق اپنے نقشے کے مطابق مسجد بنالے تو مسجد بن جانے کے بعد سب کی مسجد ہے اور اس کے تقدس کی حفاظت سب کی

مشترکہ ذمہ داری ہے۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے اس اعلان کو جانباز مرزا مرحوم نے تفصیل کے ساتھ ''کاروان احرار'' میں نقل کر دیا ہے جس میں انہوں نے قیام پاکستان کے بعد لاہور میں جلسہ عام میں کہا تھا کہ ہماری ایک رائے تھی جسے قوم نے قبول نہیں کیا لیکن اب جبکہ پاکستان بن گیا ہے اور ہم سب کا وطن ہے، اس کی سالمیت، خودمختاری اور استحکام کے لیے جدوجہد کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے اور ہم پاکستان کے تحفظ اور دفاع میں کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

تحریک پاکستان کی مخالفت میں سب سے بڑا نام مولانا ابوالکلام آزادؒ کا ہے۔ انہوں نے صرف قیام پاکستان کی مخالفت نہیں کی بلکہ اس کے خلاف کانگریس کی مہم کی قیادت کی کہ اس دور میں انڈین نیشنل کانگریس کے سربراہ وہی تھے لیکن قیام پاکستان کے بعد انہوں نے مختلف مسلم شخصیات اور حلقوں کو پاکستان کے استحکام کے لیے کام کرنے کی تلقین کی اور پاکستان کی سالمیت اور خودمختاری کے تحفظ کو جنوبی ایشیا کے مسلمانوں اور عالم اسلام کے لیے ضروری قرار دیا۔ صدیقی ٹرسٹ کراچی نے حال ہی میں ''ابوالکلام آزاد اور پاکستان'' کے عنوان سے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے جس میں دیگر شخصیات کے علاوہ معروف ماہر تعلیم ڈاکٹر برکت علی قریشی کا یہ انکشاف بھی نقل کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر قریشی کانگریسی تھے اور مولانا آزادؒ اور پنڈت جواہر لال نہرو کے دوستوں میں سے تھے۔ انہوں نے قیام پاکستان کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کے کہنے پر بھارت میں رہنے کا فیصلہ کیا اور پنڈت نہرو نے انہیں کسی عرب ملک میں بھارت کا سفیر بنانے کی پیشکش کی جسے انہوں نے قبول کر لیا لیکن بعد میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کے کہنے پر انہوں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا اور بھارت میں رہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ مولانا آزاد نے انہیں کہا کہ آپ کا بھارت میں رہنے کا فیصلہ درست نہیں ہے آپ کو پاکستان جانا چاہئے اور اس نئے مسلم ملک کے استحکام اور ترقی کے لیے کام کرنا چاہئے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ میں نے تعجب سے مولانا آزادؒ سے ان کے اس ارشاد کی وجہ پوچھی تو فرمایا،

''میرے بھائی ہم نے تقسیم ہند کی مخالفت کی تھی اور کئی اسباب میں سے ایک سبب اس

مخالفت کا یہ خوف بھی تھا کہ اس تقسیم کے ساتھ ملت اسلامیہ ہند بھی تقسیم ہو جائے گی اور اس کی طاقت گھٹ جائے گی مگر ملت کی اکثریت نے ہماری رائے کے خلاف فیصلہ دیا ہم ہار گئے اور پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ پاکستان وجود میں نہ آتا تو اور بات تھی اور اب ظہور میں آ گیا ہے تو ہر دوسرے اسلامی ملک کی طرح ہمیں یہ ملک بھی عزیز ہے بلکہ دوسرے ممالک سے بڑھ کر عزیز ہے اب اسے باقی رہنا چاہیے۔ اس کا بن کر بگڑ جانا سارے عالم اسلام کی شکست کے برابر ہوگا اور اس کا وجود میں آ کر پیدا ہو جانا سارے عالم اسلام کی توہین ہوگا۔ اب آپ لوگ بھارت کی طرف نہ دیکھیں اب آپ پاکستان کو مضبوط بنائیں ہم یہاں آپ لوگوں کی بہتری کے لیے دعا کرتے رہیں گے آپ پاکستان کی خدمت کریں۔''

ہمارے خیال میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کے اس ارشاد میں ہم سب کے لیے پیغام یہ ہے کہ پاکستان کے مستقبل کو محدود علاقائی مفادات کے حوالہ سے نہ دیکھا جائے بلکہ عالم اسلام کے اجتماعی مفاد کے تناظر میں دیکھا جائے۔ پاکستان کو عالم اسلام کے مجموعی ماحول سے الگ کر دینے کی کوئی تجویز نہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے مفاد میں ہے اور نہ ہی ملت اسلامیہ کے مفاد میں ہو سکتی ہے۔

(روزنامہ اسلام ۲۹ رجولائی ۲۰۰۳ء)

پاکستان اور عالم اسلام کا مستقبل!

مولانا فضل الرحمٰن کی قیادت میں جمعیت علمائے اسلام کا وفد بھارت کے دورے سے واپس آ گیا ہے ،وفد میں جمعیت کے تین دوسرے لیڈر حافظ حسین احمد،مولانا گل نصیب خان ،اور مولانا قاضی حمید اللہ خان بھی شامل تھے ۔،انہوں نے دیوبند میں حاضری کے علاوہ جمعیت علمائے ہند کے راہنماؤں اور بھارتی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی سمیت متعدد بھارتی لیڈروں سے ملاقاتیں کیں ۔جن میں انڈین نیشنل کانگریس کی لیڈر سونیا گاندھی بھی شامل ہیں،اس دورے کا اصل پس منظر تو یہ ہے کہ کچھ عرصہ قبل پشاور میں جمعیت علمائے اسلام کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی ''خدمات دارالعلوم دیوبند کانفرنس''میں شرکت کے لیے دارالعلوم دیوبند اور جمعیت علمائے اسلام کے قائدین پاکستان تشریف لائے تھے ،اوراب جمعیت علمائے اسلام کے قائدین نے ضروری سمجھا کہ وہ بھی بھارت جائیں اور دارالعلوم دیوبند اور جمعیت علماے ہند کے مراکز میں حاضری دیں ،مگر اسکے ساتھ چونکہ سیاسی ماحول سے فائدہ اٹھانا اور اپنی ہر بات سے سیاسی فوائد حاصل کرنا ہر سیاسی لیڈر کا حق سمجھا جاتا ہے ۔اس لیے موجودہ علاقائی سیاست اور ماحول کے تناظر میں اس کی کوشش بھی ہوئی اور اس کے اثرات وثمرات بھی سامنے آئے ۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان ٹریک ٹو اور بیک چینل ڈپلومیسی کا سلسلہ ایک عرصہ سے جاری ہے ،دانش وروں ،صحافیوں ،ریٹائرڈ افسروں ،جرنیلوں اور ثقافتی فنکاروں کے وفود آ جارہے ہیں ،پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے ،دونوں ملکوں کو میز پر

بٹھانے اور باہمی گفتگو کے ذریعے تنازعات کو حل کرانے کی تگ و دو ہو رہی ہے، بڑے صنعتی ممالک کے گروپ جی ایٹ کو جلدی ہے کہ تنازعات جلدی کسی کنارے پر لگیں تا کہ دونوں ملکوں کے درمیان سرحدوں کو پابندیوں کو ختم یا کم از کم کر کے ''فری ٹریڈ'' کے ذریعے اس وسیع وعریض منڈی سے فائدہ اٹھایا جا سکے، پاکستان کی ایٹمی صلاحیت اور ایک مضبوط فوج کو زائد از ضرورت سمجھنے والوں کی خواہش ہے کہ پاک بھارت مصالحت کا اہتمام کر کے پاکستان سے کہا جائے کہ اب اسے ایٹمی صلاحیت اور اتنی بڑی فوج کی ضرورت نہیں رہی ،اس لیے وہ ان سے دست بردار ہونے کی تیاری کر لے ، پاکستان کی نظریاتی حیثیت اور اسلامی تشخص کو عالم اسلام کے مستقبل کے حوالے سے خطرہ باور کرنے والوں کا جی چاہتا ہے کہ اسے یورپی یونین طرز کی کسی ''انڈین یونین' کا حصہ بنا کر اس کی چودہراہٹ کی صلاحیت کو مفلوج کر دیا جائے ،تا کہ یہ امکان ہی سرے سے باقی نہ رہے کہ عالم اسلام کبھی اسلام کے نان پر دوبارہ متحد ہو سکتا ہے اور پاکستان اسکی قیادت کر سکتا ہے۔

اس تناظر میں پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کم کرنے کی کوششوں میں یہ پہلو بھی خاصا موثر ثابت ہو سکتا ہے کہ جمعیت علمائے اسلام پاکستان اور جمعیت علمائے ہند کے درمیان تعلقات سے فائدہ اٹھایا جائے ،دارالعلوم دیوبند کے ساتھ پاکستان کے ہزاروں علماے کرام اور لاکھوں دینداروں عقیدت اور تعلیمی وفکری تعلق کو دونوں ملکوں کی باہمی کشیدگی اور کشمکش میں کمی لانے کا ذریعہ بنایا جائے ، چنانچہ اس پس منظر نے جمعیت علمائے اسلام پاکستان کے قائدین کے دورہ بھارت میں اچھا خاصا سیاسی رنگ بھر دیا اسے ''علماء ڈپلومیسی'' کا نام دیا گیا اور اسکے حوالے سے پاکستان اور بھارت کے باہمی قرب میں اضافہ کی نوید سنائی گئی، وفد کے سربراہ مولانا فضل الرحمٰن اور ان کے رفقا نے بھی اس ''رنگ آمیزی'' سے دامن بچانے کی کوشش نہیں کی اور خدا جانے یہ خود ان کی حکمت عملی تھی یا کسی ''بریفنگ'' کا نتیجہ کہ ان کے اس دورے کو پاک بھارت کشیدگی کم کر نے کی اس مہم سے پوری طرح جوڑ دیا گیا۔، جمعیت علمائے اسلام کے راہنماؤں کے بھارت جانے سے عمومی تاثر یہی سامنے آیا کہ وہ بھی اس ''ٹریک ٹو ڈپلومیسی'' کا حصہ بن گئے ہیں جو پاکستان اور بھارت کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے ایک عرصہ سے جاری ہے ،اور جسے مذکورہ

بالا مقاصد کے لیے بتدریج آگے بڑھایا جارہا ہے۔

اس دوران میڈیا کے ''گوریلا سیکشن'' نے اس صورت حال سے خوب فائدہ اٹھایا، مولانا فضل الرحمٰن کے حوالے کے گرما گرم خبریں سامنے آئیں، چٹ پٹے بیانات پڑھنے کو ملے، پاکستان اور بھارت کو دوبارہ متحد کرنے کے امکان پر بات ہوئی، اور جرمنی کے اتحاد کا حوالہ بھی دیا گیا، کشمیری مجاہدین کی مسلح جدوجہد کے سلسلہ میں تحفظات کا اظہار ہوا، جموں وکشمیر کی کنٹرول لائن کو بین الاقوامی سرحد بنانے کا ذکر ہوا اور شملہ معاہدے کو تنازعات کے حل کے لیے بنیاد بنانے کی تجویز منظر عام پر ہوئی، اور بھارتی وزیراعظم کی پاکستان آنے کی آمادگی کی خوشخبری بھی قوم نے سنی، مولانا فضل الرحمٰن نے ان میں سے بہت سی باتوں کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ انہوں نے یہ باتیں نہیں کہیں، اور خاص طور پر ''اکھنڈ بھارت'' والی بات تو انہوں نے قطعاً نہیں کہی اور نہ وہ اس پر یقین رکھتے ہیں، لیکن ان کے حوالے سے یہ باتیں ایک بار بین الاقوامی پریس میں آچکی ہیں، تو ایک عرصہ تک گفتگو اور تبصروں کا موضوع رہیں گی، اور مولانا فضل الرحمٰن کی واضح تردید کے باوجود ہر موقع پر ان کا حوالہ دیا جائے گا۔

جناب سرور کائنات ﷺ نے غالباً اس قسم کی صورت حال کے حوالے سے فرمایا تھا کہ ''اتقوا مواضع التہم''، تہمت کے مقامات سے بچو۔ یعنی ایسی جگہ مت کھڑے ہو، جہاں تمہیں دیکھ کر لوگ خواہ مخواہ شک وشبہ سے دوچار ہوں اور کسی کو تمہارے بارے میں کچھ کہنے کا موقع مل جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ مولانا فضل الرحمٰن نے یہ باتیں نہیں کہیں اور وہ جو تردید کر رہے ہیں، سو فی صد درست ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ''ٹریک ٹو ڈپلومیسی'' کے جس قافلے میں وہ شامل تھے اور انکے سے قبل جو لوگ بھارت گئے ہیں یا بعد میں جانے والے ہیں، ان میں اکثر لوگ اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں، اور وہ صرف زبانی نہیں بلکہ بیانات اور کالموں میں بھی یہ باتیں آرہی ہیں، اس لیے اس کیچڑ میں چلتے ہوئے اپنے کپڑے بار بار سمیٹنے کے باوجود وہ اسکے چھینٹوں سے اپنا دامن نہیں بچا سکیں گے، یہی وجہ ہے کہ مولانا فضل الرحمٰن کے واضح تردیدی بیانات کے باوجود ایک دوست نے مجھ سے پوچھ ہی لیا کہ کیا مولانا فضل الرحمٰن نے یہ باتیں کہیں ہیں؟ اور آپ کا اس سلسلہ میں کیا موقف ہے

؟میں نے جواب میں عرض کیا کہ جب مولانا فضل الرحمٰن کہتے ہیں کہ انہوں نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی، اور یہ سب کچھ میڈیا کے ''گوریلا سیکشن'' کی کارستانی ہے تو ہمیں ان کی بات پر یقین کر لینا چاہیے اور ان پر اعتماد کرنا چاہیے، باقی رہی بات ہمارے موقف کی تو اس کی وضاحت قیام پاکستان کے فوراً بعد تحریک پاکستان کے دو بہت بڑے مخالفوں نے کر دی تھی۔

ان میں ایک سید حسین احمد مدنیؒ جن کا مکتوب اٹک کے مولانا فضل راہد الحسینیؒ کی کتاب ''چراغ محمدؐ'' میں موجود ہے، جس میں انہوں نے فرمایا کہ قیام پاکستان سے قبل ہمارے اختلاف کی نوعیت ایسی ہی تھی، جیسے کسی محلّہ میں مسجد بنانے پر اختلاف ہو جائے، ایک گروہ اس کے سائز، مقام اور نقشہ میں ایک رائے رکھتا وہ اور دوسرے فریق کی رائے اس سے مختلف ہو، ان میں ایک فریق غالب آ گیا اور اس نے اپنی تجویز کے مطابق مسجد بنالی، دوسرے فریق کی رائے نہ چل سکی، لیکن جب مسجد بن گئی، تو وہ سب کی مسجد ہے اور اسکے تقدس کی حفاظت سب کی ذمہ داری ہے۔

دوسرے بزرگ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ہیں جو تحریک پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش تھے، لیکن جب پاکستان بن گیا تو انہوں نے لاہور میں کھلے بندوں جلسہ عام منعقد کر کے اعلان کیا کہ ہماری ایک رائے تھی، جسے قوم نے قبول نہیں کیا اس لیے ہم قوم کا فیصلہ قبول کرتے ہیں، پاکستان ہمارا وطن ہے اس کی بقا اور استحکام ہماری ذمہ داری ہے اور ہم اس کی سلامتی اور تحفظ کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے، اسکے بعد کسی اور حوالے کی ضرورت شاید باقی نہیں رہی، لیکن اس حوالے ایک اور بات کو تذکرہ بھی ضرور کرنا چاہوں گا، ......جن دنوں ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد مشرقی پاکستان کا بحران درپیش تھا، اور جنرل یحیٰ خان، شیخ مجیب الرحمٰن اور جناب ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان پاکستان کے مستقبل کے بارے میں مذاکرات جاری تھے، اس موقع پر قومی اسمبلی کے چھوٹے گروپوں نے بھی مذاکرات میں حصہ لیا تھا، اور اس مذاکراتی وفد میں مولانا مفتی محمودؒ بھی شامل تھے، مفتی صاحبؒ نے جمعیت علمائے اسلام کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں یہ بات بتائی کہ وہ اور خان عبدالولی خان دونوں شیخ مجیب الرحمٰن سے ملاقات و گفتگو کے لیے گئے تو انہوں نے شیخ صاحب مرحوم سے مخاطب ہو کر کہا تھا،

''شیخ صاحب! آپ مسلم لیگی ہیں اور ہمیں کانگریسی کہا جاتا ہے۔کل آپ پاکستان بنا رہے تھے تو ہم نے کہا تھا کہ ایسا نہ کرو۔اس سے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو نقصان ہوگا،مگر آپ نے ہماری بات نہیں سنی۔آج آپ لوگ پاکستان توڑ رہے ہیں تو ہم آپ کو یہ کہنے آئے ہیں کہ پاکستان کو نہ توڑو،اس سے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو نقصان ہوگا......''

کیونکہ پاکستان جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی امیدوں اور تمناؤں کا مرکز ہے اور جس حالت میں بھی ہے، ان کی آزادی اور خودمختاری کی علامت ہے۔اس کی بقا اور استحکام اور سالمیت و خودمختاری سے صرف جنوبی ایشیا ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا مستقبل وابستہ ہے،اس لیے اسے ختم یا کمزور کرنے کی کسی کوشش کو مولانا مدنی اور امیر شریعت کے کسی پیروکار کی حمایت حاصل نہیں ہوسکتی۔

(روزنامہ پاکستان،۵/اگست ۲۰۰۳)

عراق پر امریکی حملہ اور ایم ایم اے کے مظاہرے

پاکستان مسلم لیگ (ق) کے صدر چودھری شجاعت حسین نے ایک بیان میں کہا ہے کہ ہم مسلمان بھائیوں کے خون کے بدلے ملنے والے پیسوں پر لعنت بھیجتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی آئی ہے کہ امریکہ نے پاکستان کے ذمے ایک ارب ڈالر کا قرضہ معاف کر دیا ہے جس کے بارے میں بعض سرکاری حلقوں کا کہنا ہے کہ ایسا کر کے امریکہ نے وہ وعدہ پورا کیا ہے جو اس نے دہشت گردی کے خلاف امریکہ کی عالمی مہم میں اس کا ساتھ دینے کے حوالے سے پاکستانی حکومت کے ساتھ کر رکھا تھا۔ محترم چودھری شجاعت حسین نے یہ بھی کہا ہے کہ عراق پر امریکی حملے کے خلاف لاہور، راولپنڈی، کراچی، ملتان، پشاور اور دیگر شہروں میں جو ملین مارچ ہوئے ہیں، ان میں پاکستان مسلم لیگ کی حمایت بھی شامل تھی اور ہمارے ساتھی بھی اس میں شریک ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ متحدہ مجلس عمل اسے سیاسی مسئلہ نہ بنائے اور اس سے سیاسی فوائد حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔

ہمیں چودھری صاحب کے اس ارشاد سے اتفاق ہے کہ عراق پر امریکی حملہ کے خلاف ملین مارچ کے ان پروگراموں کی کال اگرچہ متحدہ مجلس عمل نے دی ہے، لیکن اس میں تمام طبقات کے لوگ شریک ہو رہے ہیں اور ان مظاہروں کے ذریعے سے پوری قوم نے متفقہ طور پر یہ عوامی فیصلہ دے دیا ہے کہ پاکستانی قوم بحیثیت قوم عراق پر امریکی اتحاد کے حملے کی مذمت کرتی ہے، اسے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جنگ تصور کرتی ہے اور پاکستان کے عوام اس جنگ میں عراق کے مظلوم اور غیور عوام کے ساتھ ہیں۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے، وہ تو امریکی حملے کے خلاف پوری

طرح متحد ہیں اوران کی آواز ایک ہے، لیکن ہماری سیاسی قیادت کی ترجیحات بہرحال اپنی جگہ موجود ہیں اور ہر باشعور شہری کونظر آ رہی ہیں۔ پاکستان مسلم لیگ (ق) اس وقت ملک کی مقتدر جماعت ہے اوراس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ پاکستانی عوام کی اکثریت کی نمائندگی کرتی ہے۔اس حوالے سے عراق پر امریکی یلغار کے خلاف عوامی جذبات کومنظّم کرنے کے زور پر عوامی مہم کی قیادت کرنے کی ذمہ داری اس کی بنتی ہے، مگر چوہدری شجاعت حسین یہ فرما کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہم بھی تو مجلس عمل کے ساتھ ہیں اور ہم بھی مسلمان بھائیوں کے خون کے بدلے ملنے والے پیسوں کو اچھا نہیں سمجھتے اوران پر لعنت بھیجتے ہیں۔

دوسری طرف پاکستان پیپلز پارٹی کا طرزِ عمل سب کے سامنے ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی ہمیشہ سے عوام کی سیاست کرنے کی دعوے دار رہی ہے اور استعمار دشمنی کے نعروں میں آگے آگے رہتی ہے، لیکن افغانستان اوراس کے بعد عراق کے عوام کے خلاف سامراجی قوتوں اور عالمی استعمار کی کھلم کھلا دہشت گردی کے بارے میں پی پی پی کی قیادت نے جو سیاسی حکمت عملی اپنا رکھی ہے، اس نے عوام دوستی اور سامراج دشمنی کے سارے پردے ایک ایک کر کے اس کے چہرے سے اتار دیے ہیں۔کون نہیں جانتا کہ محترمہ بینظیر بھٹو نے گزشتہ دو سالوں کے دوران امریکہ کے کتنے چکر لگائے ہیں اور امریکی حکام سے بالواسطہ اور بلا واسطہ ملاقاتیں کر کے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں انہیں اعتماد دلانے کی کوشش کی ہے کہ یہ جنگ جنرل پرویز مشرف کے بجائے وہ زیادہ بہتر طور پر لڑ سکتی ہیں اس، لیے انہیں دوبارہ چانس دیا جائے اور دوبارہ ایسا موقع فراہم کیا جائے کہ وہ بنیاد پرستی اور دہشت گردی کو کچلنے کے لیے امریکہ کے زیرسایہ موثر کردار ادا کرتے ہوئے اپنی سابقہ کوتاہیوں کی تلافی کر سکیں، اوراس حقیقت سے کون آنکھیں بند کر سکتا ہے کہ امریکہ کے خلاف حالیہ عوامی مظاہروں کی قیادت میں آگے نہ آنے میں بھی پی پی پی قیادت کی یہی حکمت عملی کارفرما ہے کہ کہیں امریکہ بہادراس قدر ناراض نہ ہو جائے کہ اس کے بعد کوئی اور چانس ملنے کا امکان ہی باقی نہ رہے۔

اس پس منظر میں اگر متحدہ مجلس عمل نے آگے بڑھ کر امریکہ کے مخالف مظاہروں کی کال دی ہے، انہیں منظّم کرنے کے لیے محنت کی ہے اوران کی قیادت کر کے عوامی جذبات کو سیاسی زبان دی

ہے تو اسے اس کے کریڈٹ اور سیاسی فوائد سے محروم کرنا اور ''سیاست'' کا طعنہ دے کر اس کی اہمیت کو کم کرنا چودھری شجاعت حسین جیسے سنجیدہ سیاست دان کے لیے کسی درجے میں بھی مناسب نہیں ہے۔ چودھری صاحب ملک کی مقتدر سیاسی جماعت کے سربراہ ہیں اور ان کی زبان سے یہ باتیں سن کر ہمیں خوشی ہوتی ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادی عراق پر ناجائز طور پر حملہ آور ہیں، یہ سراسر ظلم ہے، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف معاندانہ جنگ ہے اور ہم اس حملہ کی مذمت کرتے ہیں۔ پھر چودھری صاحب کا یہ ارشاد بھی ہمارے لیے خوشی کا باعث بنا ہے کہ ہم مسلمانوں کے خون کے بدلے ملنے والی رقم پر لعنت بھیجتے ہیں، لیکن ملک کے مقتدر ترین سیاستدان کی حیثیت سے ان سے ہمارا سوال ہے کہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے پاکستان کو قرضوں میں جو معافیاں اور سہولتیں مل رہی ہیں اور مزید امداد کے جو وعدے ہو رہے ہیں، وہ کس چیز کا معاوضہ ہیں؟ اور امریکہ اور اس کے اتحادی پاکستان پر اس قدر مہربان کیسے ہو گئے ہیں کہ اسلام آباد کو اٹھتے بیٹھتے آمریت اور ڈکٹیٹر شپ کا طعنہ دینے والی حکومتیں اچانک قرضے معاف کرنے، انہیں ری شیڈول کرنے اور نئے قرضے دینے کے لیے کس لیے تیار نظر آتی ہیں؟ کیا اس کے پیچھے اپنے مسلمان بھائیوں کا خون چودھری صاحب کو نظر نہیں آ رہا؟ پھر عراقی بھائیوں پر بموں کی مسلسل بارش کے دوران اور عراقی بھائیوں کی تڑپتی لاشوں اور کٹتے جسموں کے تناظر میں پاکستان کو ایک ارب ڈالر کے قرضے کی معافی کی ''خوشخبری'' دینے کا کیا مطلب ہے؟ چودھری صاحب زمیندار ہیں، جاٹ ہیں اور پنجاب کے جاٹوں کی تاریخی روایات کے امین ہیں اور دوستیاں اور دشمنیاں رکھنے والے ڈیرے دار ہیں۔ اگر ان کا مطلب وہ بھی نہیں سمجھتے تو پاکستان میں اور کون ہے جو اس کا مطلب سمجھتا ہوگا؟

چودھری صاحب سے ہماری دوسری گزارش یہ ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے وہ یہ تصور کریں کہ چوہدری ظہور الٰہی مرحوم آج زندہ ہیں اور موجودہ عالمی اور ملکی تناظر کو دیکھ رہے ہیں اور پھر یہ سوچیں کہ کیا آج کے حالات کے تناظر میں چوہدری ظہور الٰہی مرحوم کا کردار یہی ہوتا جو آج ان کا خاندان ادا کر رہا ہے؟ ہم چوہدری ظہور الٰہی مرحوم کو جانتے ہیں ہم نے ان کے ساتھ سالہا سال تک سیاسی کام کیا ہے، ہمیں یقین ہے کہ اگر چوہدری ظہور الٰہی مرحوم آج موجود ہوتے تو امریکہ کے خلاف

عوامی مظاہروں اور عالم اسلام کو امریکہ کے خلاف متحد کرنے کی مہم کا پرچم ان کے ہاتھ میں ہوتا اور وہ منہ میں ''گھنگھنیاں'' ڈال کر دبے لفظوں میں صرف یہ نہ کہہ رہے ہوتے کہ ''ہم بھی تو ساتھی ہی ہیں''۔ یہ صرف چودھری صاحب کی بات نہیں ہے، بلکہ اس حوالہ سے ہمارے جذبات اور احساسات یہ ہیں کہ آج ذوالفقار علی بھٹو، جنرل ضیاء الحق مرحوم، چودھری ظہور الٰہی مرحوم میں سے کوئی بھی زندہ ہوتا تو ان کا کردار یقیناً وہ نہ ہوتا جو ان کی جانشینی کی دعوے دار اولاد ادا کر رہی ہے اور ایک باحوصلہ، مدبر اور غیرت مند قیادت کی موجودگی قوم کے لیے یقیناً اطمینان اور اعتماد کا باعث ہوتی۔ اس پس منظر میں اگر مفتی محمود کا بیٹا اپنے باپ کی روایات کو قائم رکھے ہوئے ہے اور اسے دیکھ کر عوام کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر آج کے حالات میں مفتی محمود زندہ ہوتے تو وہ بھی یہی کرتے جو ان کا بیٹا کر رہا ہے تو چودھری صاحب کو اسے ''سیاست بازی'' کا طعنہ دینے کے بجائے اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اور اس کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے نہ صرف اپنے باپ کی روایات کا پرچم تھام رکھا ہے بلکہ وہ چودھری شجاعت حسین کے والد محترم کی جرات و حوصلہ کا پرچم بھی اٹھائے ہوئے ہے۔

چودھری شجاعت حسین ایک محترم سیاسی لیڈر ہیں، ہمارے انتہائی محترم بزرگ دوست کے بیٹے ہیں اور ان سے ہمیں بہت سی توقعات ہیں جن میں سے سب سے بڑی توقع یہ ہے کہ اے کاش کہ وہ آمریت کو برسرعام للکارنے والا ظہور الٰہی بنیں، مچھ جیل والا ظہور الٰہی، بلوچستان کے مظلوم کی حمایت میں آواز بلند کرنے والا ظہور الٰہی اور آمریت کو برسرعام للکارنے والا ظہور الٰہی! کیونکہ آج پنجاب کو اسی ظہور الٰہی کی ضرورت ہے جو ملک کے اس سب سے بڑے صوبے پر آمریت کے شکنجے کو مزید قوت بخشنے کے بجائے اپنی توانائیاں اس شکنجے کو توڑنے میں صرف کر سکے۔

(روزنامہ اوصاف، ۱۰/ اپریل ۲۰۰۳)

ایل ایف او اور متحدہ مجلس عمل کی شرائط

ایل۔ایف۔او پر حکومت اور متحدہ مجلس عمل سمیت اپوزیشن کے تنازع نے مولانا فضل الرحمٰن کی طرف سے ان شرائط کے اعلان کے بعد ایک نئی شکل اختیار کر لی ہے کہ اگر حکومت ملک میں

۱۔قرآن وسنت کو سپریم لاء تسلیم کر لے،

۲۔اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے مطابق قانون سازی کا اہتمام کرے،

۳۔جمعہ کی چھٹی بحال کر دے،

۴۔بلاسود بینکاری کا آغاز کرے اور

۵۔تعلیمی اداروں کی نج کاری روک دے

تو متحدہ مجلس عمل ایل ایف او کے بارے میں اپنے موقف میں لچک پیدا کر سکتی ہے۔مولانا فضل الرحمٰن نے یہ اعلان کوئٹہ میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کیا ہے، جبکہ اس سے قبل صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت نے شرعی قوانین کے نفاذ کے عملی اعلانات کا آغاز کر دیا ہے جس پر بین الاقوامی نشریاتی اداروں کے تبصروں اور حکومتی حلقوں کے بعض ذمہ دار حضرات کے ردعمل کے تناظر میں قومی سطح پر اس وقت جاری سیاسی کشمکش ایک نیا رخ اختیار کرتی نظر آ رہی ہے۔

صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دور میں بھی ملک کے دینی حلقوں کو اسی قسم کی صورت حال کا سامنا تھا۔صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے مارشل لاء کے دور میں سپریم کورٹ آف پاکستان کی اجازت سے دستور میں بہت سی ترامیم کر رکھی تھیں جن میں صدر کے اختیارات میں اضافہ اور ملکی

نظام کو عملی طور پر صدارتی طرز پر ڈھالنے کے ساتھ ساتھ بعض اسلامی ترامیم کے اقدامات بھی شامل تھے۔ جب انہوں نے ۸۵ء میں غیر جماعتی الیکشن کرائے تو انھوں نے قومی اسمبلی سے اپنی آئینی ترامیم کی منظوری حاصل کرنے اور انہیں باضابطہ دستوری حیثیت دینے کا راستہ اختیار کیا۔ انہیں اس سلسلے میں خاصی محنت کرنا پڑی اور مختلف حربوں سے کام لینا پڑا۔ اس وقت قومی اسمبلی میں ''شریعت گروپ'' کے نام سے ایک گروپ قائم ہو گیا تھا جس نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے جو آئینی ترامیم کی ہیں، ان میں اسلامائزیشن سے متعلقہ ترامیم متاثر نہ ہوں بلکہ انہیں یقینی بنانے کے لیے پارلیمنٹ سے قرآن وسنت کو دستوری طور پر ملک کا سپریم لاء قرار دلوایا جائے۔

صدر ضیاء الحق مرحوم کی آئینی ترامیم میں جہاں صدارتی اختیارات میں اضافہ اور اس نوعیت کی دیگر سیاسی دفعات شامل تھیں، وہاں خدا تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کے اعلان پر مشتمل قرارداد مقاصد کو دستور کا واجب العمل حصہ قرار دینے کی ترمیم، وفاقی شرعی عدالت کے قیام اور حدود آرڈیننس کے نفاذ کی ترامیم بھی موجود تھیں۔ یہ تمام دستوری ترامیم اسلامائزیشن کے حوالے سے بہت زیادہ اہمیت کی حامل تھیں، اس لیے ان کا تحفظ ضروری تھا۔ چنانچہ قومی اسمبلی کے بہت سے ارکان نے شریعت گروپ کی صورت میں صدر ضیاء الحق مرحوم کی طرف سے کی جانے والی دستوری ترامیم کو دستور کا باضابطہ حصہ بنانے کے لیے اس شرط پر آمادگی ظاہر کی کہ اسلامائزیشن سے تعلق رکھنے والی ترامیم کو بھی تحفظ دیا جائے اور اس کے ساتھ قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دیا جائے۔ چنانچہ آٹھویں ترمیمی بل کی صورت میں قرارداد مقاصد، وفاقی شرعی عدالت، حدود آرڈیننس اور صدارتی اختیارات سمیت صدر ضیاء الحق مرحوم کی تمام ترامیم کو دستور کا حصہ بنا دیا گیا اور قرآن وسنت کو سپریم لاء قرار دینے کے لیے قومی اسمبلی نے ایک الگ قرارداد کی صورت میں قوم سے وعدہ کیا کہ جلد ایک مستقل آئینی ترامیم کے ذریعے سے قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دے دیا جائے گا۔

اس کے بعد سینٹ آف پاکستان میں مولانا سمیع الحق اور مولانا قاضی عبد اللطیف نے قومی اسمبلی کے اسی متفقہ وعدہ کی بنیاد پر ''شریعت بل'' پیش کیا جس کی سب سے اہم دفعہ قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دینے کی تھی۔ اس شریعت بل پر کئی برس تک بحث جاری رہی، ملک بھر میں

اس کے حق میں اور مخالف وسیع پیانے پر قومی مباحثہ ہوا۔ بہت سی مذہبی اور سیاسی جماعتوں نے اس کی مخالفت بھی کی۔ اس کے لیے سینٹ آف پاکستان کے چیئر مین غلام اسحاق خان نے ملک میں رائے عامہ معلوم کرنے کا حکم دیا جس کے جواب میں اس قدر خطوط موصول ہوئے کہ سینٹ کے ریکارڈ کے مطابق اس سے قبل کسی سوال نامے پر اتنی تعداد میں جوابات موصول نہیں ہوئے تھے۔ ہر سطح پر وسیع تر قومی مباحثے کے بعد ملک کی اہم سیاسی و دینی جماعتیں اس کی حمایت میں متحد ہوئیں اور راولپنڈی کے فلیش مین ہوٹل میں مولانا فضل الرحمٰن اور میاں نواز شریف سمیت بڑے بڑے رہنماؤں نے شریک ہو کر اس کی حمایت کا اعلان کیا اور بالآخر سینٹ آف پاکستان نے شریعت بل منظور کر لیا۔ اس کے بعد ضابطہ کے مطابق شریعت بل کو قومی اسمبلی میں نوے دن کے اندر پیش ہونا تھا مگر اس سے قبل اسمبلی ٹوٹ گئی اور اس قدر طویل اور ہمہ گیر جدوجہد کے بعد سینٹ آف پاکستان سے منظور ہونے والا شریعت بل، جس کا سب سے بڑا مقصد قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دینا تھا، ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گیا۔

یہ دور بے نظیر بھٹو کا تھا جن کے بعد میاں نواز شریف برسر اقتدار آئے اور ان کے دور میں قومی اسمبلی میں ایک شریعت بل پیش ہوا جو منظور بھی ہو گیا مگر اس میں قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دینے کی بنیادی دفعہ کو اس شرط کے ساتھ مشروط کر کے غیر موثر کر دیا گیا کہ ''اس سے ملک کا سیاسی نظام اور حکومتی ڈھانچہ متاثر نہیں ہوگا۔'' ظاہر بات ہے کہ اس شرط کے بعد قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دینے کے اس فیصلے کی کوئی افادیت باقی نہیں رہ گئی تھی، اس لیے اس کا بھی کوئی عملی نتیجہ سامنے نہ آیا۔ کہا جاتا ہے کہ ملک کے سیاسی نظام اور حکومتی ڈھانچے کو قرآن وسنت کی بالادستی کے دائرہ سے باہر رکھنے میں سب سے زیادہ دلچسپی اسلام آباد میں امریکی سفارت خانہ نے ظاہر کی اور اس کی در پردہ مساعی سے یہ سب کچھ ظہور پذیر ہوا۔

اس کے بعد مختلف مواقع پر قرآن وسنت کی دستوری بالادستی کے لیے آواز اٹھائی جاتی رہی مگر کسی طرف سے شنوائی نہیں ہوئی۔ اب اگر متحدہ مجلس عمل نے صدر جنرل پرویز مشرف کے ساتھ سیاسی بارگیننگ کے دوران اس مسئلہ کو دوبارہ اعلیٰ سطح پر اٹھایا ہے تو اگرچہ میرے جیسے نظریاتی

کارکنوں کے لیے یہ بات انتہائی تکلیف دہ ہے کہ اسلامائزیشن کی طرف کسی بھی پیش رفت کا موقع آخر سیاسی سودے بازی کے حوالہ سے ہی کیوں سامنے آتا ہے اور ملک کے مقتدر سیاسی حلقے اسے خود اپنی دینی وملی ذمہ داری سمجھنے کے لیے کیوں تیار نہیں ہیں، مگر اس کے باوجود ہماری خواہش ہے کہ متحدہ مجلس عمل کو اس مہم میں کامیابی حاصل ہو اور خدا کرے کہ وہ صدر جنرل پرویز مشرف کو اس بات کا قائل کرنے میں کامیاب ہو جائے کہ اگر وہ اپنی ذات، صدارت اور وردی کو ملک کے لیے ناگزیر تصور کرتے ہیں تو اسلام اس سے کہیں زیادہ ملک کے لیے ناگزیر ہے۔ پاکستان کی بنیاد ہی اسلام پر ہے اور اسلام کے بغیر پاکستان کے جداگانہ تشخص اور ایک الگ ملک کے طور پر اس کے وجود کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہتا۔

متحدہ مجلس عمل کی دیگر شرائط بھی اسی نوعیت کی ہیں۔ مثلاً اسلامی نظریاتی کونسل ملک کا دستوری ادارہ ہے جس نے دستور پاکستان کی طرف سے تفویض کردہ ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے ملک کے تمام مروجہ قوانین کا جائزہ لے کر انہیں اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے سفارشات مکمل کر کے انہیں حکومت کو پیش کر دیا ہے اور حکومت دستوری طور پر انہیں قومی اسمبلی میں پیش کر کے ان کے مطابق قانون سازی کی پابند ہے۔ اس صورت میں یہ شرط یا تجویز کوئی نیا مطالبہ نہیں بلکہ حکومت کو اس کی دستوری ذمہ داری کی طرف توجہ دلانے کی ایک کوشش ہے اور ہمارے خیال میں حکومت کو اس میں بھی کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے۔ البتہ صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم اور جنرل پرویز مشرف کی دستوری ترامیم میں دو فرق موجود ہیں۔ ایک یہ کہ صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم کی دستوری ترامیم میں اسلامائزیشن سے متعلقہ اہم ترامیم بھی شامل تھیں جن کے تحفظ میں ملک کے دینی حلقوں کی اپنی دلچسپی موجود تھی جبکہ جنرل پرویز مشرف کی تمام ترامیم سیاسی نظام اور صدارتی اختیارات کے حوالہ سے ہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ صدر ضیاء الحق مرحوم نے اپنی ترامیم کو حرف آخر قرار نہیں دیا تھا بلکہ انہیں منتخب قومی اسمبلی سے منظور کرانے کا راستہ اختیار کیا تھا جو ایک جائز اور معقول بات تھی مگر صدر جنرل پرویز مشرف اپنی دستوری ترامیم کو حرف آخر قرار دے کر قومی اسمبلی کو ان پر غور تک کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں اور خود اپنی ذات کو ہی دستور اور دستوری اداروں کے مترادف قرار دینے پر مصر

ہیں۔اس پس منظر میں متحدہ مجلس عمل کی یہ مہم زیادہ کٹھن اور صبر آزما ہے اور اس کے آگے بڑھنے میں کامیابی کے محدود امکانات کے ساتھ ساتھ خطرات وخدشات کا ایک خطرناک صحرا بھی سامنے دکھائی دے رہا ہے۔

قرآن وسنت کو ملک کا بالاتر قانون قرار دینے اور اسلامائزیشن کی طرف کسی بھی حوالے سے پیش رفت کی کوئی بھی کوشش ہوتو اسے بہرحال ملک کے دینی حلقوں اور نفاذ اسلام کی خواہش رکھنے والے عوام کی حمایت حاصل ہوگی۔خدا کرے کہ کوئی کوشش اس سلسلے میں بھی بارآور ہو اور ملک صحیح معنوں میں ایک اسلامی ریاست کی حیثیت اختیار کر سکے، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اوصاف، ۴/ جون ۲۰۰۳ء)

تحفظ نسواں بل سے متعلق علما کمیٹی کی سفارشات

حدود آرڈیننس میں ترامیم بل کے حوالے سے جو بحران پیدا ہوتا نظر آ رہا تھا، وہ بحمد اللہ پاکستان مسلم لیگ (ق) کے سربراہ چودھری شجاعت حسین اور قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف مولانا فضل الرحمٰن کی خصوصی حکمت عملی اور توجہ کے باعث باہمی افہام وتفہیم کے ساتھ اصولی طور پر رک گیا ہے اور اگر تحفظ حقوق نسواں بل کو قومی اسمبلی میں دوبارہ پیش کرتے وقت کوئی اور الجھن پیدا نہ ہوئی تو امید ہے کہ اس مسئلے پر کوئی نیا بحران کھڑا نہیں ہوگا اور اس کے ملک کی سالمیت پر بھی دوررس اثرات مرتب ہوں گے۔

پاکستان مسلم لیگ اور متحدہ مجلس عمل کے اس مفاہمتی عمل کے لیے غیر سیاسی علما کی جو کمیٹی مقرر کی گئی تھی، اس میں راقم الحروف بھی شامل تھا اور سارے مذاکراتی عمل میں شریک رہا۔ اس کے اختتام پر جب پاکستان ٹی وی نے میرے تاثرات دریافت کیے تو میں نے عرض کیا کہ مجھے دو باتوں پر خوشی ہوئی ہے۔ ایک اس بات پر کہ حکمران پارٹی اور متحدہ مجلس عمل نے اس اہم مسئلے پر محاذ آرائی کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے مفاہمت کے ساتھ یہ مسئلہ حل کرنے کو ترجیح دی ہے اور دوسری بات میرے لیے خوشی کی یہ ہے کہ اس عمل کے نتیجے میں دنیا کو ایک بار پھر یہ پیغام مل گیا ہے کہ پاکستان اپنے اسلامی تشخص پر اور قرآن وسنت کے ساتھ وفاداری کے عہد پر بدستور قائم ہے اور آج کے عالمی ماحول میں میرے نزدیک یہ بات سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

حدود آرڈیننس میں ترامیم کا یہ مسودہ جو تحفظ حقوق نسواں بل کے عنوان سے قومی اسمبلی میں

زیر بحث ہے اور جس میں قرآن وسنت کے منافی دفعات کی نشاندہی اور اصلاح کے لیے علمائے کرام کی یہ کمیٹی بنائی گئی تھی، دراصل اس طویل نظریاتی اور تہذیبی کشمکش کا ایک حصہ ہے جو پاکستان کے نظریاتی اسلامی تشخص کے تحفظ اور پاکستانی معاشرے میں اسلامی اقدار وروایات کی بقا، یا انہیں کمزور کر کے مغربی ثقافت وتمدن کو رواج دینے کے لیے ایک عرصہ سے جاری ہے اور ایک عرصہ تک جاری رہے گی۔ ایک سیکولر دانشور کے نزدیک یہ ''نان ایشو'' ہے لیکن اگر یہ مہم کامیاب ہو جاتی اور ترمیمی بل کے منظور ہو جانے کی صورت میں حدود آرڈیننس محض شوپیس بن کر رہ جاتا تو یہی مسئلہ ہمارے ان دانشوروں کے ہاں ''کرنٹ ایشو'' قرار پاتا اور اسے سولائزیشن اور آزادی کی طرف تاریخی قدم قرار دے کر اس کے حق میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دیے جاتے۔

مذاکرات کے اس عمل کا آغاز اس طرح ہوا کہ چودھری شجاعت حسین اور مولانا فضل الرحمٰن کے درمیان ایک ملاقات میں اس بات پر اتفاق رائے ہو گیا کہ کچھ ایسے علما کو بھی حدود آرڈیننس میں اور تحفظ حقوق نسواں بل پر مباحثہ میں شریک کر لیا جائے جو عملی سیاست میں فریق نہ ہوں اور جن کی رائے کو قبول کرنے میں فریقین میں سے کسی کو بھی اختلاف نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے جن علما کے ناموں پر اتفاق رائے ہوا، ان میں جسٹس (ر) مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا حسن جان، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا مفتی منیب الرحمٰن، مولانا مفتی غلام الرحمٰن، ڈاکٹر سرفراز نعیمی اور راقم الحروف شامل ہیں۔ مجھے جب اس بات کی اطلاع دی گئی تو میں نے عرض کیا کہ میرے لیے یہ اعزاز اور سعادت کی بات ہے۔ چودھری شجاعت حسین صاحب نے خود فون پر مجھ سے بات کر کے دریافت کیا تو میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ اگرچہ بعض دوستوں کی طرف سے یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ ان علمائے کرام کے لیے غیر سیاسی، غیر جانبدار اور سرکاری علما کی جو اصطلاحات قومی اخبارات میں استعمال کی گئی ہیں، کیا میرے لیے وہ قابل قبول ہیں؟ اس پر میں نے عرض کیا کہ اس کا تعلق معروضی حالات اور ملی ضروریات سے ہے اور ان دونوں کے تقاضے یکجا ہو جائیں تو مجھے ان میں سے کسی بات میں بھی تامل نہیں ہے۔ جہاں تک سیاست کا تعلق ہے، میں سیاست کو دین کا ایک شعبہ اور دینی ضروریات کا ایک اہم حصہ سمجھتا ہوں۔ اس سے دست برداری یا لاتعلقی میرے نزدیک

دین کے ایک حصے سے لاتعلقی ہے، البتہ یہ تقسیم کار کی بات ہے کہ اقتدار اور الیکشن کی سیاست کے لیے خود کو موزوں نہ سمجھتے ہوئے نفاذ اسلام کی جدوجہد کے فکری اور علمی شعبے کو میں نے اپنی تگ و تاز کا میدان بنایا ہوا ہے۔

میں ۱۹۶۵ء سے ۱۹۹۰ء تک عملی انتخابی اور جماعتی سیاست کا ایک متحرک کردار رہا ہوں جبکہ ۱۹۹۰ء کے بعد سے فکری اور علمی شعبے میں مصروف عمل ہوں۔ اسے اگر غیر سیاسی ہونا کہا جاتا ہے تو ایسا کہنے والوں سے میں کیا عرض کر سکتا ہوں؟ باقی رہی بات غیر جانبداری کی تو حکومت اور اپوزیشن یا سیاسی جماعتوں کے سیاسی جھگڑوں اور پاور پالیٹکس میں تو غیر جانبدار ہو سکتا ہوں اور کسی حد تک ہوں بھی، مگر دینی و ملی مسائل کے بارے میں غیر جانبدار ہونا میرے لیے ممکن ہی نہیں ہے، بالخصوص اسلامائزیشن سے متعلقہ امور میں غیر جانبدار ہو جانا تو شاید بعض صورتوں میں کفر کی حدود تک بھی پہنچا دیتا ہے، البتہ سرکاری علما کی پھبتی بالکل خلاف واقعہ ہے اس لیے کہ ان علما کے نام صرف حکمران پارٹی کی طرف سے نہیں آئے بلکہ قائد حزب اختلاف کی رضامندی بھی اس میں شامل تھی، یہی وجہ ہے کہ تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں ان علمائے کرام نے جو سفارشات دی ہیں، ان میں انہوں نے اپنے کام کے حوالے سے دونوں کا تذکرہ کیا ہے۔

میں اس سارے معاملے کو ایک اور حوالے سے بھی دیکھتا ہوں کہ یہ معاملہ حضرت مولانا مفتی محمود اورؒ چودھری ظہور الٰہی مرحوم کے بیٹوں کے درمیان ہوا ہے۔ ان دونوں راہنماؤں میں ایک عرصہ تک رفاقت رہی ہے، بالخصوص ۷۴ء کی تحریک ختم نبوت اور ۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰ میں مولانا مفتی محمودؒ اور چودھری ظہور الٰہی مرحومؒ کا قائدانہ کردار تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ چودھری صاحب مرحوم کٹڑ مسلم لیگی تھے اور ان کا سیاسی مزاج بھی خالصتاً مسلم لیگی تھا، لیکن یہ میرے ذاتی مشاہدے کی بات ہے کہ ملک کے اسلامی تشخص اور دینی امور کے حوالے سے وہ دوٹوک رائے رکھتے تھے اور ان کے بارے میں عملی طور پر بے لچک ہو جایا کرتے تھے۔ یہ خوبی ان کے سیاسی جانشینوں چودھری شجاعت حسین اور چودھری پرویز الٰہی میں بھی پائی جاتی ہے اور مختلف مواقع پر دیکھا گیا ہے کہ قومی وحدت، ملکی سیاست، پاکستان کے اسلامی تشخص اور دینی احکام و روایات کے تحفظ

کے بارے میں جو تقاضا ان کی سمجھ میں آ گیا ہے، اس میں انہوں نے کوئی لچک نہیں دکھائی۔

بہرحال اس پس منظر میں مذکورہ بالا علمائے کرام کے ساتھ میں بھی اسلام آباد حاضر ہوا اور حدود آرڈیننس میں ترامیم کے لیے ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کے عنوان سے قومی اسمبلی میں پیش کیے جانے والے نئے مسودہ قانون پر بحث و مباحثہ میں شرکت کی۔ یہ گفتگو ان علمائے کرام کی وزارت قانون کے اعلیٰ ترین افسران کے ساتھ ہوئی۔ اس میں چودھری شجاعت حسین، چودھری پرویز الٰہی، سردار نصر اللہ دریشک اور دوسرے اہم حضرات بھی مسلسل شریک رہے۔ علمائے کرام نے مذاکرات کے آغاز سے قبل آپس میں دو باتیں طے کر لیں۔ ایک یہ کہ پاکستانی معاشرے میں عورت کی مظلومیت اور حقوق کے بارے میں اصل اور عملی مسائل کے بارے میں بھی حکومت کو توجہ دلائی جائے اور چند اہم امور کی نشان دہی کر کے حکومت سے کہا جائے کہ انہیں اس مسودہ قانون میں شامل کیا جائے یا ان کے لیے الگ قانون سازی کی جائے۔ یہ امور درجہ ذیل ہیں:

☆ ہمارے معاشرے میں عام طور پر عورتوں کو وراثت میں ان کا حصہ نہیں ملتا اور وہ خاندانی یا معاشرتی دباؤ کی وجہ سے خاموش رہ کر اپنے حق سے محروم ہو جاتی ہیں۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے قانون سازی کی ضرورت ہے۔

☆ عام طور پر عورتوں کو ان کا مہر بھی نہیں ملتا۔ یا تو کسی حیلے بہانے سے معاف کرا لیا جاتا ہے یا وہ مہر لڑکی کا باپ وصول کر لیتا ہے اور لڑکی کو نہیں ملتا۔ اس کا بھی قانونی طور پر سد باب ضروری ہے۔

☆ بیک وقت تین طلاقیں دے دینا شرعاً بھی ناپسندیدہ ہے اور اس سے بہت سے خاندانی اور معاشرتی مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں، اس لیے موجودہ حالات میں یہ ضروری ہو گیا ہے کہ یک بارگی تین طلاقیں دینے کو قانوناً قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے اور اس میں وثیقہ نویسوں اور عرضی نویسوں کو بھی شریک جرم بنایا جائے۔

☆ جبری وٹہ سٹہ جسے شریعت نے ''نکاح شغار'' کا نام دیا ہے، اس کی بھی قانونی ممانعت کی جائے۔

☆ بالغ لڑکی کی مرضی کے خلاف اس کے جبری نکاح کو قانوناً قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے۔

☆ قرآن کریم کے ساتھ نکاح کی مذموم رسم کا خاتمہ کیا جائے۔

☆ کاروکاری اور اس طرح کے دیگر غیر شرعی رسوم ورواج کے خاتمے کے لیے قانون سازی کی جائے۔

دوسری بات جو علمائے کرام نے اس میں طے کی تھی، یہ تھی کہ دو تین اصولی اور اہم امور کو پہلے زیر بحث لایا جائے۔ اگر حکومت ان کے بارے میں ہماری بات قبول کرنے کو تیار ہو تو باقی امور پر بات کی جائے، ورنہ مسودہ قانون پر مزید بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان میں تین باتیں ہمارے نزدیک زیادہ اہمیت رکھتی ہیں:

(۱) زنا بالجبر کو نئے مسودہ میں حدود شرعیہ سے نکال کر تعزیر میں شامل کر دیا گیا ہے جو قطعی طور پر غلط ہے۔ اسے حدود میں واپس لایا جائے اور اس کی سزا رجم ہی رکھی جائے۔

(۲) زنا بالرضا میں شرعی شہادتیں پوری ہونے کی صورت میں اس کی سزا حد شرعی یعنی رجم رکھی گئی ہے، لیکن شہادت کا نصاب مکمل نہ ہونے کی صورت میں زنا سے متعلقہ دیگر جرائم کو تعزیرات سے بھی نکال دیا گیا ہے۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ زنا بالرضا کا اگر شرعی ثبوت نہ بھی مل سکے تو اس سے متعلقہ جو جرائم ثابت ہو چکے ہوتے ہیں، مثلاً مرد اور عورت کی ناجائز خلوت اور دیگر دواعی زنا، ان کے تعزیری احکام کو بحال کیا جائے۔

(۳) حدود آرڈیننس کو باقی قوانین پر بالاتر حیثیت دی گئی تھی، اسے نئے مسودہ قانون میں ختم کر دیا گیا ہے۔ اسے دوبارہ بحال کیا جائے۔

ان تینوں امور پر ہمارا موقف بحمد اللہ تسلیم کر لیا گیا، اس طرح کہ زنا بالجبر کو دوبارہ حدود شرعیہ کے دائرہ میں واپس لے جانے کا فیصلہ ہوا، زنا بالرضا سے متعلقہ قابل تعزیر جرائم کو جرائم کی فہرست میں دوبارہ شامل کرنے کے لیے تعزیرات پاکستان میں ایک نئی تعزیری دفعہ کا اضافہ تجویز ہوا جس کا متن بھی باہمی مشورے سے طے ہو گیا جبکہ حدود شرعیہ کے قانون کی بالادستی کے لیے ایک متبادل شق کا متن طے کیا گیا جو مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کی رائے میں پہلی دفعہ سے زیادہ بہتر اور واضح ہے۔ ان امور پر اتفاق رائے کو تحریری شکل میں لایا گیا جس میں علمائے کرام نے واضح کیا کہ یہ رائے صرف

ان امور کے بارے میں ہے۔ باقی معاملات میں اگر رائے طلب کی گئی تو وہ بعد میں دی جاسکتی ہے۔اب ان سفارشات کی روشنی میں وزارت قانون تحفظِ حقوق نسواں بل کے قومی اسمبلی میں پیش کردہ مسودہ میں کیسی ترامیم لاتی ہے،ایک دوروز میں یہ بات بھی واضح ہوجائے گی۔

(روزنامہ پاکستان،۱۵ر ستمبر۲۰۰۶ء)

’مجلس تحفظ حدود اللہ‘ کا قیام اور متحدہ مجلس عمل کی ریلی

’’تحفظ حقوق نسواں بل‘‘ کے بارے میں اسلامی نظریہ کونسل کی حالیہ رائے، مختلف مکاتب فکر کے علمائے کرام کی طرف سے ’’مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان‘‘ کے قیام کے ساتھ اس بل کے خلاف جدوجہد کے اعلان اور متحدہ مجلس عمل کی لاہور سے گجرات تک ریلی کے بعد اس سلسلے میں صورت حال خاصی دلچسپ ہوتی جارہی ہے، مگر اس حوالے سے کچھ عرض کرنے سے قبل ایک وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ تحفظ حقوق نسواں بل کی منظوری کے فوراً بعد ۱۸/نومبر کو شائع ہونے والے اپنے اسی کالم میں راقم الحروف نے لکھا تھا کہ اس بل کے ذریعے ’’زنا بالرضا‘‘ کی صورت میں بھی شرعی حد (سنگسار یا سوکوڑے) ختم کر دی گئی ہے اور اس طرح زنا کے جرم میں شرعی حد کا مکمل طور پر خاتمہ ہوگیا ہے۔ اسی کالم میں یہ وضاحت بھی موجود تھی کہ ابھی تک بل کا اصل متن سامنے نہیں ہے اور اس تاثر کی بنیاد صدر جنرل پرویز مشرف کی نشری تقریر کا یہ جملہ ہے کہ ’’زنا بالرضا‘‘ کے معاملے میں چار گواہوں کی شرط ختم کر دی گئی ہے اور ماہرین قانون اور پاکستان مسلم لیگ کے ارکان اسمبلی نے غور وخوض کے بعد ۴۹۶۔ بی کی دفعہ متعارف کرائی ہے جس کے تحت زنا بالرضا پر پانچ سال سزا ہوسکتی ہے۔

صدر محترم کے اس ارشاد سے نہ صرف ہم نے، بلکہ موقر معاصر ’’نوائے وقت‘‘ کے اداریہ نگار نے بھی یہی مفہوم سمجھا کہ زنا بالرضا پر شرعی حد ختم کر کے پانچ سال قید کی سزا مقرر کر دی گئی ہے، لیکن بعد میں بل کا متن سامنے آنے پر معلوم ہوا کہ یہ تاثر درست نہیں ہے اور اس نئے قانون میں زنا بالرضا کی صورت میں مکمل شرعی ثبوت فراہم ہونے پر حد شرعی (سنگسار یا سوکوڑے) کی سزا بحال

رکھی گئی ہے، البتہ زنا کا مکمل ثبوت فراہم نہ ہونے کی صورت میں اس سے نچلے درجے کے جرائم کو فحاشی کا عنوان دے کر ان پر پانچ سال تک قید کی سزا مقرر کی گئی ہے۔

اس وضاحت کے بعد اب اسلامی نظریاتی کونسل کی اس رائے کی طرف آتے ہیں جو گزشتہ روز صدر جنرل پرویز مشرف کی زیر صدارت منعقد ہونے والے کونسل کے اجلاس میں دی گئی ہے اور اس میں اسلامی نظریاتی کونسل نے اخباری رپورٹ کے مطابق ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کی حمایت کر دی ہے۔ اس سے قبل کونسل کے چیئر مین ڈاکٹر خالد مسعود صاحب کا یہ بیان اخبارات کی زینت بن چکا ہے کہ اسلامی نظریہ کونسل نے تحفظ حقوق نسواں بل پر باقاعدہ طور پر غور نہیں کیا اور ان سمیت کونسل کے بعض ارکان نے ذاتی طور پر اپنی رائے دی ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق اس کے بعد بھی ''تحفظ حقوق نسواں بل'' باقاعدہ رائے کے لیے کونسل کو نہیں بھجوایا گیا اور کونسل کی رائے اس بل کے حق میں شو کرنے کے لیے صدر جنرل مشرف کی صدارت میں اسلامی نظریہ کونسل کے اجلاس کا اہتمام ضروری سمجھا گیا، جبکہ اجلاس میں شریک ہونے والے کونسل کے ایک رکن محترم جاوید احمد غامدی کی طرف سے یہ وضاحت آئی ہے کہ وہ کونسل کی رکنیت سے مستعفی ہو چکے ہیں اور صدر جنرل پرویز مشرف کی زیر صدارت منعقد ہونے والے اجلاس میں انہوں نے اس لیے شرکت کی ہے کہ ان کا استعفا ابھی منظور نہیں ہوا مگر اجلاس میں انہوں نے اس بل کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی۔

اس پس منظر میں اگر یہ کہا جائے کہ اسلامی نظریہ کونسل نے ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کی حمایت کی ہے تو اس کی اخلاقی اور قانونی حیثیت کے بارے میں مزید کچھ عرض کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، البتہ کونسل کے چیئر مین ڈاکٹر خالد مسعود کی رائے اور پوزیشن اس سے ضرور واضح ہو گئی ہے۔ ہم نے کچھ عرصہ قبل ایک کالم میں ان سے گزارش کی تھی کہ وہ ملک کے دینی و سیکولر حلقوں کے درمیان اسلامی احکام و قوانین کی تعبیر و تشریح کے بارے میں جاری کشمکش میں فریق بننے کی بجائے توازن اور اعتدال کا راستہ اختیار کریں، مگر انہوں نے درمیان میں رہنے کی بجائے ان دانشوروں کی صف میں کھڑا ہونا پسند کر لیا ہے جو عورت کے بارے میں مغرب اور مسلمانوں کے درمیان موجودہ فکری و تہذیبی تنازع میں مغرب کو اس کی غلطیوں کی طرف توجہ دلانے کی بجائے قرآن و سنت کے

احکام وقوانین میں ردوبدل کر کے انہیں مغرب کے سانچے میں ڈھالنے کا راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ جہاں تک اسلامی نظریہ کونسل اور اس کے چیئر مین کی موجودہ پوزیشن کا تعلق ہے، اسے دیکھ کر صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں قائم ہونے والا ''ادارۂ تحقیقات اسلامی'' یاد آنے لگا ہے جس کے سربراہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن تھے اور انہوں نے بھی دین کی تعبیر وتشریح کے بارے میں یہی رویہ اختیار کر رکھا تھا جواب ڈاکٹر خالد مسعود اور ان کے رفقا نے اپنایا ہے۔

اس وقت بھی فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم کی شخصیت اپنے تمام جاہ وجلال کے ساتھ ان کی پشت پر تھی اور تمام سرکاری وسائل ان کے ساتھ تھے، لیکن ملک کے دینی حلقوں اور عوام کو ان کا یہ رویہ برداشت نہیں ہوا تھا اور جب عوام سڑکوں پر آ گئے تو ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو ہی میدان چھوڑنا پڑا تھا۔ دوسری طرف ملک کے تمام معروف دینی حلقے ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کے خلاف صف آرائی کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ جامعہ اشرفیہ لاہور میں ۲۷ رنومبر کو منعقد ہونے والے ''تحفظ حدود اللہ کنونشن'' میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور اہل تشیع کے سرکردہ علماء کرام نے مجتمع ہو کر اس بل کے خلاف بھرپور یک جہتی کا اظہار کیا ہے، جبکہ جامعہ نعیمیہ لاہور میں اس کے دو روز بعد بریلوی مکتب فکر کے علماء کرام بھی انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنا موقف تسلسل کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بطور خاص نوٹ کرنے کی ہے کہ حکومتی حلقے ملک بھر میں کسی جگہ بھی دینی مکاتب فکر کے معروف حلقوں میں سے کسی ایک عالم دین کی حمایت بھی اس بل کے لیے حاصل نہیں کر سکے اور تمام مکاتب فکر اس مسئلے میں مکمل اتحاد اور ہم آہنگی کا اظہار کر رہے ہیں۔

''مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان'' کا قیام اسی یک جہتی کے اظہار کی عملی صورت ہے جسے پورے ملک میں ضلعی سطح پر منظّم کرنے کا پروگرام بنایا جا رہا ہے۔ ۱۰ر دسمبر کو کراچی میں تمام مکاتب فکر کے علمائے کرام، مشائخ عظام اور دینی کارکنوں کے بھرپور اور نمائندہ کنونشن کا اعلان کر دیا گیا ہے جس میں ''مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان'' کے تنظیمی ڈھانچے اور آئندہ جدوجہد کے لائحہ عمل کا فیصلہ کیا جائے گا۔ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری اس سلسلے میں متحرک کردار ادا کر رہے ہیں اور ہمارا اندازہ ہے کہ جن لائنوں پر وہ کام کر رہے ہیں، اگر

اس کا تسلسل جاری رہا تو وہ تحریک تحفظ ختم نبوت کی طرز پر ملک کے دینی حلقوں کو متحد کرنے اور سڑکوں پر لانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اب متحدہ مجلس عمل کی ریلی کے معاملات پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ حکومتی حلقوں نے اسے ناکام قرار دیا ہے لیکن اس ''ناکامی'' کے لیے صوبائی حکومت کو جو پاپڑ بیلنے پڑے ہیں، اس پر لاہور سے گجرات تک کے عوام عینی شاہد ہیں۔ خود میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ مجھے اس روز پسرور سے سیالکوٹ جانے والے راستے پر واقع گاؤں ''لوہارکے'' میں ظہر کے بعد طالبات کے ایک مدرسے میں بخاری شریف کے سبق کے آغاز کی تقریب میں شریک ہونا تھا۔ وہیں کے ایک دوست گاڑی پر مجھے وہاں لے گئے۔ جب ہم پسرور پہنچ کر سیالکوٹ روڈ کی طرف مڑے تو پولیس کے ناکے پر ہمیں روک لیا گیا۔ ناکے کے انچارج پولیس آفیسر کوئی صاحب بہادر قسم کے تھے۔ انہوں نے ایک اہل کار کو بھیجا کہ مولوی صاحب کو کہو کہ انہیں آفیسر بلا رہے ہیں۔ میں نے اپنے میزبان ساتھی سے کہا کہ وہ جا کر صاحب بہادر کی بات سن لیں۔ وہ گئے تو پوچھا گیا کہ آپ لوگ کدھر جا رہے ہیں ؟ انہوں نے جواب دیا کہ لوہارکے جا رہے ہیں۔ صاحب بہادر نے کہا کہ ادھر تو سیالکوٹ ہے۔ گویا ہمارا سیالکوٹ جانا ان کے نزدیک ''جرم'' تھا۔ ہمارے ساتھی نے جواب دیا کہ ہم لوہارکے جا رہے ہیں اور میں اسی علاقے کا رہنے والا ہوں۔ اس دوست نے عقل مندی سے کام لیا کہ میرا تعارف نہیں کروایا، ورنہ شاید ہماری یہ بات تسلیم نہ کی جاتی کہ ہم واقعی سیالکوٹ نہیں بلکہ لوہارکے جا رہے ہیں۔ وہاں سے فارغ ہو کر ہم نے ڈسکہ کے راستے گوجرانوالہ واپسی کا پروگرام بنایا تو ڈسکہ میں نہر کے پل پر ٹریفک بلاک تھی۔ پوچھنے پر بتایا گیا کہ ناکہ بندی کی وجہ سے پل بلاک ہے اور ادھر سے سر دست گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک نکلنے کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ مغرب کے قریب کا وقت تھا، چنانچہ ہم نہر کے ساتھ ساتھ کچے راستے پر چلتے ہوئے نہر کے اگلے پل تک پہنچے اور گلوٹیاں سے ہوتے ہوئے گوجرانوالہ واپس آ سکے۔

متحدہ مجلس عمل کی ریلی نے لاہور سے جی ٹی روڈ پر گجرات جانا تھا مگر جی ٹی روڈ سے کم از کم پچاس کلومیٹر دور پسرور میں ناکہ بندی کا یہ حال تھا تو خود لاہور، گوجرانوالہ اور گجرات کا کیا حال ہوگا؟

لوہار کے میں دوستوں نے ہمیں بتایا کہ آج ادھر ٹریفک بند ہے اوران کے بقول ویگن ڈرائیور کواس ''جرم'' میں پولیس اہلکارروں سے مار پڑی ہے کہ وہ گاڑی سڑک پر کیوں لایا ہے۔اس سب کچھ کے باوجود متحدہ مجلس عمل کے سربراہ قاضی حسین احمد نے گوجرانوالہ میں ریلی سے خطاب کیا ہے اوران کی گرفتاری کے بعد ریلی کے کچھ حضرات تمام تر رکاوٹوں کوعبور کرتے ہوئے گجرات تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں تو اسے ''ناکام'' کہنے کا اعزاز چودھری پرویز الٰہی اور جناب محمد علی درانی ہی حاصل کرسکتے ہیں۔ بہرحال ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کے حوالے سے ایک نئی صورت حال سامنے آرہی ہے جواس حوالے سے نئی نہیں ہے کہ دینی حلقے مذہبی اقدار کے تحفظ کے لیے ایک بار پھر متحد ہوکر سامنے آرہے ہیں۔اس سے قبل تحفظ ختم نبوت اور تحفظ ناموس رسالتؐ کے لیے کئی بار ایسا ہو چکا ہے، جبکہ امریکی وزارت خارجہ کی ایک حالیہ رپورٹ میں حدود آرڈیننس کو بھی تحفظ ختم نبوت اور تحفظ ناموس رسالتؐ کے قوانین کے ساتھ منسلک کرتے ہوئے حکومت پاکستان پران قوانین کے خاتمے کے لیے زور دیا گیا ہے۔ البتہ اس حوالے سے یہ صورت حال ضرور نئی ہے کہ چودھری ظہور الٰہی مرحوم کا خاندان اس بار دینی حلقوں کا ساتھ دینے کی بجائے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کررہا ہے، حالانکہ چودھری ظہور الٰہی مرحوم تحریک ختم نبوت میں بھی دینی حلقوں کے ساتھ تھے اور تحریک نظام مصطفیؐ کے تو قائدین میں شامل تھے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ چودھری شجاعت حسین اور چودھری پرویز الٰہی، صدر پرویز مشرف کا قرب حاصل کرنے اور پیپلز پارٹی کو مات دینے کی مہم میں چودھری ظہور الٰہی مرحوم کی روایات سے کہاں تک دامن چھڑا سکتے ہیں۔

(روزنامہ پاکستان، ۴/دسمبر ۲۰۰۶ء)

تحفظ نسواں بل اور مجلس عمل کا کردار

''مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان'' کے کراچی کنونشن کے بعد اس سلسلہ میں جدوجہد نے جو صورتحال اختیار کر لی ہے، وہ بہت سے حوالوں سے غور طلب ہے اور دینی حلقوں سے سنجیدہ توجہ کا تقاضا کر رہی ہے۔ حکمران حلقوں نے اس حوالے سے واضح موقف اختیار کر لیا ہے کہ انہوں نے جو کیا ہے، ٹھیک کیا ہے۔ وہ اس کے خلاف کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں اور نہ ہی ان کے خیال میں ''تحفظ حقوق نسواں'' کے عنوان سے نافذ شدہ ایکٹ پر نظر ثانی کی گنجائش ہے۔ گزشتہ دنوں تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علمائے کرام نے مشترکہ طور پر جو نئی یادداشت چودھری شجاعت حسین صاحب سے خود مل کر ان کے حوالے کی ہے، اسے بھی پذیرائی حاصل نہیں ہوئی بلکہ حکمران جماعت نے چودھری صاحب ہی کی زیر صدارت اجلاس میں ''تحفظ حقوق نسواں ایکٹ'' کی ایک قرارداد کے ذریعے تحسین کرتے ہوئے اس پر نظر ثانی کے دروازے کو بند کر دیا ہے اور حکمران جماعت کے اس اجلاس کے حوالہ سے جو خبر اخبارات میں شائع ہوئی ہے، اس میں یہ بات کہہ دی گئی ہے کہ منظور شدہ ایکٹ کے بارے میں کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ البتہ چودھری شجاعت حسین صاحب نے حقوق نسواں کے تحفظ کے نام سے جو نیا بل اسمبلی میں جمع کرایا ہے، اس کے لیے علمائے کرام سے مشاورت ہو سکتی ہے اور ان کی کچھ تجاویز کو اس میں شامل کیا جا سکتا ہے، حالانکہ اس مجوزہ بل میں جو باتیں شامل کی گئی ہیں وہ دراصل علماء کرام ہی کی وہ تجاویز ہیں جو انہوں نے پاکستانی معاشرہ کے معروضی تناظر میں خواتین کو درپیش حقیقی مسائل کی طرف توجہ دلاتے ہوئے پیش کی تھیں۔ اس طرح محسوس یوں ہوتا ہے کہ یہ نیا بل لا کر دراصل علمائے کرام کا منہ بند کرنے اور اس کے ذریعے تحفظ حقوق نسواں کے

منظور شدہ متنازعہ ایکٹ کو ہضم کرانے کی راہ ہموار کی جا رہی ہے جو ایک خطرناک چال ہے اور اس کا مقصد ان امور کے بارے میں علمائے کرام کو خاموش کرانا ہے جو وہ منظور شدہ متنازعہ ایکٹ میں قرآن وسنت کے صریح احکام کی خلاف ورزی کے طور پر قوم کے سامنے لا رہے ہیں۔ مجھ سے گزشتہ روز ایک ذریعے سے دریافت کیا گیا ہے کہ چودھری شجاعت حسین صاحب کے پیش کردہ نئے بل کے بارے میں اگر علمائے کرام کو مشاورت کے لیے بلایا جائے تو آپ کا ردِعمل کیا ہوگا؟ میں نے گزارش کی کہ جب تک منظور شدہ ''حقوق نسواں ایکٹ'' کا تنازعہ صاف نہیں ہوتا اور اس کے بارے میں علمائے کرام کے اعتراضات دور نہیں کیے جاتے، اس وقت تک نئے بل کے بارے میں کوئی بات کرنا درست نہیں ہوگا۔ یہ منظور شدہ ایکٹ کی خلاف اسلام باتوں سے توجہ ہٹانے کی ایک کوشش ہوگی جس سے علمائے کرام کو بہرحال بچنا چاہیے اور ذاتی طور پر میں کسی ایسی مشاورت میں شرکت کے لیے تیار نہیں ہوں جس میں متنازعہ ایکٹ کی خلاف شریعت باتوں پر خاموشی اختیار کرتے ہوئے نئے بل کو قابل قبول بنانے کے لیے گفتگو کا اہتمام کیا گیا ہو۔

متنازعہ ایکٹ کی منظوری کے بعد بعض وفاقی وزرا نے اپنے باس سمیت علمائے کرام اور دینی حلقوں کے بارے میں جو توہین آمیز لب ولہجہ اختیار کر رکھا ہے، وہ بجائے خود ایک مستقل مسئلہ ہے اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ حکمران طبقہ کے نزدیک حدود شرعیہ کو غیر موثر بنانے کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے کہیں زیادہ یہ مسئلہ اہم ہے کہ علمائے کرام کی کردار کشی کی جائے، ان کے خلاف نفرت انگیزی کی مہم کو تیز کیا جائے اور عوامی حلقوں میں دین کی تعبیر وتشریح کے حوالہ سے علمائے کرام کا جو اعتماد موجود ہے، اسے کسی نہ کسی طرح ختم کر کے قرآن وسنت کی تشریح وتعبیر کو آزادانہ ماحول میں ریاستی اداروں اور حکمران طبقہ کی صوابدید کے دائرہ میں شامل کر دیا جائے کہ وہ جب چاہیں، جس طرح چاہیں، قرآن وسنت کے کسی مسئلہ کو اپنی مرضی کے معنی پہنا کر اسے اسلام اور قرآن وسنت کے نام سے ملک کے قانون ونظام کا حصہ بنا سکیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں اس میں کامیابی حاصل ہوتی ہے یا نہیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ یہ نہیں ہوگی، اس لیے کہ قرآن کریم اور اس کی زبان تک بلکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعبیرات وتشریحات اور سنت وحدیث تک عام مسلمان کو رسائی میسر ہے

اور دینی مدارس کے وسیع ترنیٹ ورک کی برکت سے کوئی بھی مسلمان کسی بھی وقت یہ معلوم کرسکتا ہے کہ قرآن کریم کی فلاں آیت یا فلاں جملے کا ترجمہ کیا ہے، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل کے ساتھ اس کی کیا تشریح کی ہے، صحابہ کرامؓ نے اس پر کس انداز سے عمل کیا ہے اور امت کے جمہور فقہا نے اس کا کیا مطلب و مفہوم سمجھا ہے؟ جب تک ایک عام مسلمان کی ان چاروں امور تک رسائی کے مواقع موجود ہیں، قرآن و سنت کے کسی حکم کی غلط تشریح اور اسے من مانے مفہوم کے ساتھ امت سے قبول کرانے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اس کا تجربہ اس سے قبل امت میں بہت دفعہ ہو چکا ہے۔ اب بھی اس ناکام تجربہ کو ایک بار پھر دہرایا جا رہا ہے لیکن پہلے کی طرح اب بھی یہ تجربہ کامیابی کی دہلیز پار نہیں کر سکے گا۔

علمائے کرام اور دینی حلقوں کی کردار کشی اور ان کے خلاف منافرت کی مہم بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جو حضرات برطانوی استعمار کے تسلط کے دور میں علمائے کرام اور دینی کارکنوں کے خلاف چلائی گئی مکروہ پراپیگنڈا مہم اور معاشرہ میں انہیں کارنر کرنے کی مسلسل تگ ودو سے واقف ہیں، وہ ہماری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ وہ مہم آج کی مہم سے زیادہ سخت اور صبر آزما تھی اور اس وقت کے محمد علی درانی اور شیر افگن صاحبان کی زبانیں زیادہ لمبی تھیں، جبکہ علمائے کرام اور دینی حلقوں کے پاس اپنے دفاع اور اپنا موقف پیش کرنے کے مواقع آج سے کہیں کم تھے، اس کے باوجود سوسائٹی سے علمائے کرام کا تعلق منقطع کرنے اور انہیں کارنر کرنے کی کوششیں کامیاب نہیں ہوسکیں۔ اس لیے ان دو حوالوں سے تو تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر مجھے کچھ زیادہ پریشانی نہیں ہے اور میرا طالب علمانہ وجدان یہ کہتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ قرآن و سنت اور امت کے اجماعی علمی ماضی کے ساتھ نئی پود کا رشتہ اور کمٹمنٹ زیادہ مضبوط ہوگی بلکہ علمائے کرام اور دینی حلقے بھی آزمائش کی اس نئی بھٹی سے گزر کر پہلے سے زیادہ مضبوط پوزیشن حاصل کریں گے۔ میری پریشانی اس جدوجہد میں علمائے کرام کے کردار، طرز عمل اور حکمت عملی کے بارے میں ہے اور میں اس کے دو پہلوؤں پر کچھ گزارش کرنا چاہوں گا۔

ایک پہلو یہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام، دینی قائدین اور مذہبی راہ نما علمی اور فکری طور پر اس

مہم کو پوری سنجیدگی کے ساتھ ڈیل نہیں کر رہے ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں دینی حلقوں کے ارباب فکر و دانش کی درجنوں محافل میں شرکت کا موقع ملا ہے اور میں نے ان محافل میں شریک علمائے کرام، خطبا اور دینی کارکنوں کی کم وبیش پچانوے فیصد اکثریت کو اصل مسئلہ سے بے خبر پایا ہے۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ حدود آرڈیننس کیا تھا؟ تحفظ حقوق نسواں ایکٹ کیا ہے؟ کن مسائل میں تبدیلیاں ہوئی ہیں؟ اعتراضات کیا ہیں؟ پس منظر کیا ہے؟ مقاصد کیا ہیں؟ اور اس ایکٹ کی منظوری کے بعد ملک کے قانونی نظام اور معاشرتی ماحول میں کیا تبدیلیاں رونما ہوں گی؟ اس سلسلہ میں بعض اہل علم نے سنجیدہ کام کیا ہے اور بہت سے مفید مضامین اور کتابچے سامنے لائے گئے ہیں مگر کسی کو پڑھنے کی فرصت نہیں ہے اور کسی کے نظام الاوقات میں مطالعہ، تحقیق اور غور وفکر کی گنجائش نہیں ہے۔

ملک کے تین چار بڑے شہروں سے دوستوں کے فون گزشتہ ہفتے کے دوران موصول ہوئے ہیں اور ہر جگہ کے احباب کا کہنا ہے کہ حقوق نسواں ایکٹ کے حوالہ سے ہمیں معلوم نہیں ہے کہ اصل مسئلہ کیا ہے اور تنازعہ کی نوعیت اور تفصیلات کیا ہیں۔ ایک شہر سے فون میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہم شہر کے بڑے بڑے دینی اداروں میں گئے ہیں، ہمیں کہیں سے صحیح معلومات نہیں مل رہی ہیں اور صورت حال واضح نہیں ہو رہی ہے۔ ایک صاحب سے میں نے دریافت کیا کہ اس سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی مدظلہ کا جامع مضمون کم وبیش تمام قومی اخبارات میں شائع ہوا ہے، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری کے مضامین شائع ہوئے ہیں، میرے درجنوں مضامین روزنامہ 'اسلام' اور روزنامہ 'پاکستان' میں شائع ہو چکے ہیں اور دیگر بہت سے اصحاب قلم کی نگارشات قومی پریس کے ذریعہ مسلسل سامنے آ رہی ہیں، مگر معلوم ہوا کہ ہمارے علمائے کرام، خطبائے عظام، دینی راہ نماؤں، مدرسین، ائمہ مساجد حتیٰ کہ اس جدوجہد میں فرنٹ لائن کے لوگوں یعنی اسمبلیوں کے ممبر علمائے کرام کے پاس بھی ان مضامین پر ایک نظر ڈالنے کی فرصت نہیں ہے۔

ایک دوست نے بتایا کہ ٹی وی کے مختلف چینلز پر اس مسئلے پر جو مباحثے یا انٹرویو ہوئے ہیں، ان میں مولانا مفتی تقی عثمانی یا مولانا مفتی منیب الرحمٰن کے سوا کسی گفتگو میں ان سوالات کا جواب موجود نہیں تھا جو تحفظ حقوق نسواں بل کے سلسلہ میں لوگوں کے ذہنوں میں پیدا کر دیے گئے ہیں۔

ان صاحب کا کہنا تھا کہ دینی حلقوں کی نمائندگی کرنے والے حضرات کی گفتگو میں سطحیت، جذباتیت اور معروضی صورت حال سے بے خبری صاف صاف دکھائی دیتی ہے جو کسی پبلک جلسے میں تو چل جاتی ہے لیکن گفتگو کی میز پر، جہاں دوسری طرف سے استدلال اور معلومات کا کھلا استعمال ہو رہا ہو، اس طرز کی گفتگو اکثر اوقات فائدہ کی بجائے نقصان کا باعث بن جاتی ہے اور اس سے گفتگو کرنے والوں کی علمی تہی دامنی کا تاثر زیادہ اجاگر ہوتا ہے۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ دلائل موجود نہیں ہیں یا معلومات میسر نہیں ہیں یا ان تک رسائی کے مواقع مہیا نہیں ہیں۔ یہ سب کچھ موجود ہے مگر ہمارے پاس فرصت نہیں ہے کہ ہم خود کو اس کے لیے محنت اور تگ ودو پر تیار نہیں کر پا رہے۔ اس ماحول میں اتنی بڑی جنگ لڑنا بہت مشکل کام ہے اور ہمیں بہر حال اپنے اس طرز عمل پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔

میری پریشانی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہم اس جدوجہد کے دینی اور سیاسی ماحول کو گڈ مڈ کرتے جا رہے ہیں جو بہت زیادہ نقصان کا باعث بن سکتا ہے۔ آج کا ماحول اور اس کی پیچیدگیاں دیکھ کر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور ان کے رفقا کی اس بصیرت پر میرا یقین اور زیادہ پختہ ہو گیا ہے جو انہوں نے قیام پاکستان کے بعد عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کی جدوجہد کو سیاسی کشمکش سے الگ تھلگ کر کے خالصتاً دینی اور علمی بنیادوں پر آگے بڑھانے کے لیے اختیار کی تھی اور بالآخر انہی لائنوں پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہتے ہوئے یہ جدوجہد کامیابی کی منزل سے ہمکنار ہو گئی تھی۔ مجھے جامعہ اشرفیہ لاہور میں ہونے والے اس فیصلہ سے بے حد خوشی ہوئی تھی کہ تحفظ حقوق نسواں ایکٹ کی منظوری کے بعد ملک میں قرآن وسنت کے احکام وقوانین کی شکل بگاڑنے اور نافذ شدہ چند شرعی قوانین کو ختم کرنے کی جو سرکاری مہم پورے زور وشور کے ساتھ شروع کر دی گئی ہے، اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کل جماعتی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کی طرز پر تمام مکاتب فکر کے دینی راہ نماؤں پر مشتمل ''مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان'' قائم کی جائے گی جو خالصتاً غیر سیاسی بنیادوں پر اس مقصد کے لیے رائے عامہ کو منظم کرے گی اور تمام دینی وسیاسی جماعتوں کے راہ نماؤں سے رابطہ کر کے اس جدوجہد کو صحیح معنوں میں قومی تحریک بنانے کی کوشش کرے گی۔ اس جدوجہد کا یہی فطری راستہ ہے اور اسے اسی طریقہ سے موثر طور پر آگے بڑھایا جا سکتا ہے، مگر یہ بات مجبوراً لکھنا پڑ رہی ہے کہ

دھیرے دھیرے اس جدوجہد کا یہ پہلو مجھے پس منظر میں جاتا ہوا دکھائی دے رہا ہے جو بہرحال پریشانی کی بات ہے۔ متحدہ مجلس عمل اپنے فورم سے اس مقصد کے لیے جو جدوجہد کر رہی ہے، وہ لائق تحسین ہے اور ہر دینی کارکن کو اس کی سپورٹ کرنی چاہیے۔ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی قیادت اس جدوجہد کو جس انداز سے تقویت پہنچا رہی ہے، وہ قابل داد ہے اور اس کا یہ کردار جاری رہنا چاہیے لیکن عوامی محاذ پر اس تحریک کی قیادت ''مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان'' ہی کو کرنی چاہیے اور اسے صرف ٹائٹل تک محدود رکھنے کی بجائے کل جماعتی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کی طرح کل جماعتی ''مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان'' کے نام سے منظّم کیا جانا ضروری ہے۔ اس کا باقاعدہ ڈھانچہ تشکیل دیا جائے، اس کی قیادت میں تمام مکاتب فکر کو ذمہ دارانہ نمائندگی دی جائے اور اسے ایک مستقل فورم کی شکل دی جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ ملک کے عوام کو متحدہ مجلس عمل، مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے درمیان فرق واضح طور پر دکھائی دے، ورنہ بہت سی الجھنیں اور پیچیدگیاں پیدا ہوں گی اور یہ پیچیدگیاں اس جدوجہد میں پیش رفت کی راہ میں رکاوٹ بھی بن سکتی ہیں۔

(روزنامہ اسلام، ۱۴ر دسمبر ۲۰۰۶)

یہ بات حدود آرڈیننس کو سبوتاژ کرنے کی مہم کے ساتھ ہی سامنے آ گئی تھی کہ اس معاملے میں پیش رفت کے بعد تحفظ ناموس رسالت کے قانون اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے والی دستوری دفعات اور قانون کی باری ہے، کیونکہ امریکی وزارت خارجہ نے گزشتہ سال ستمبر کے دوران واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ وہ حکومت پاکستان پر جن قوانین کے خاتمہ کے لیے دباؤ بڑھا رہے ہیں، ان میں حدود آرڈیننس کے ساتھ ساتھ تحفظ ناموس رسالت کا قانون اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی دستوری وقانونی دفعات بھی شامل ہیں چنانچہ اس کے بعد پاکستان کی حکمران مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل سید مشاہد حسین صاحب کی طرف سے مغرب کے لیے ایک یقین دہانی سامنے آئی جو انھوں نے پیرس میں ایک اجتماع سے خطاب کے دوران پیش کی کہ توہین رسالت پر موت کی سزا کے قانون میں ترامیم کی تیاری جاری ہے اور حکومت ترمیمی مسودہ قومی اسمبلی میں پیش کرنے کے لیے تیار ہے، البتہ اس سلسلے میں صرف اس قدر احتیاط سے کام لیا جا رہا ہے کہ اسے الیکشن کے بعد نئی اسمبلی میں پیش کیا جائے گا تا کہ الیکشن مہم میں اپوزیشن کے ہاتھ میں حکومت کے خلاف کوئی نیا ایشو نہ آ جائے۔

ہم اس حوالے سے ان کالموں میں یہ عرض کر چکے ہیں کہ جس طرح حدود آرڈیننس پر میڈیا میں ایک منظّم بحث چھیڑ کر اسے متنازعہ بنایا گیا، حدود آرڈیننس کے خاتمہ یا اسے غیر موثر بنانے کے خواہش مند عناصر نے ''علم ودانش'' کے نام پر اس کے خلاف وہ طوفان بدتمیزی بپا کیا کہ شرعی حدود کے حوالے سے شکوک وشبہات کا پورے ملک میں بازار گرم ہو گیا جبکہ دوسری طرف حدود شرعیہ پر سنجیدہ اور علمی گفتگو کرنے والے حلقے اس بحث میں الجھے رہے کہ الیکٹرانک میڈیا پر آنا اور شرعی

ضروریات کے لیے الیکٹرانک میڈیا کا استعمال جائز بھی ہے یا نہیں اور جب وہ بالآخر میڈیا پر آئے بھی تو اس وقت جب چڑیاں کھیت چگ چکی تھیں اور حدود شرعیہ کے خلاف مغرب نواز دانش وروں کا شور وغوغا اپنا کام دکھا چکا تھا۔

بالکل اسی طرز کی میڈیا وار اب تحفظ ناموس رسالت کے قانون کے حوالے سے شروع ہونے والی ہے اور ہمارے خیال میں اس بحث کے آغاز کا بہانہ ملکہ برطانیہ نے سلمان رشدی کو نائٹ ہڈ (سر) کا خطاب دے کر فراہم کر دیا ہے۔ جہاں تک سلمان رشدی کا تعلق ہے، ملکہ برطانیہ اور برطانوی حکومت سے یہ بات قطعی طور پر مخفی نہیں ہے اور نہ ہوسکتی ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان اس شخص سے شدید نفرت رکھتے ہیں، اس لیے کہ اس نے اپنی بے ہودہ کتاب ''شیطانی آیات'' میں سرورِ دو عالم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں جو شرم ناک گستاخیاں کی ہیں، وہ دنیا کے کسی بھی مسلمان کے لیے قطعی طور پر ناقابل برداشت ہیں اور آج کے گئے گزرے دور میں بھی مسلمان سب کچھ برداشت کرسکتا ہے، مگر قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی برداشت نہیں کرسکتا۔ وہ اپنی جان کا نذرانہ بخوشی دے دے گا لیکن ایسی کسی بے ہودگی کو کسی صورت میں برداشت نہیں کرے گا۔

سلمان رشدی کی تصنیف ''شیطانی آیات'' منظر عام پر آئی تو مسلمانان عالم اور خاص طور پر اسلامیان برطانیہ نے جس جوش وخروش کے ساتھ اپنے ایمانی جذبات اور حمیت وغیرت کا مظاہرہ کیا، وہ برطانوی حکومت اور ملکہ برطانیہ سے مخفی نہیں ہے اور گزشتہ سال ڈنمارک اور ناروے وغیرہ کے اخبارات میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخانہ کارٹون شائع ہونے پر عالم اسلام نے جس اجتماعی اور غیرت مندانہ ردعمل کا اظہار کیا، وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ اس کے بعد بھی اگر برطانوی حکومت یہ کہتی ہے کہ سلمان رشدی کو ''سر'' کا خطاب اس کی ادبی خدمات کے صلے میں دیا گیا ہے تو اسے سلمانوں کے دینی جذبات پر طنز کی ایک نئی اور مکروہ صورت کے سوا اور کچھ بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

سلمان رشدی کو سر کا خطاب ملنے کے بعد پاکستان کے قومی میڈیا میں اس سلسلے میں بحث کا

آغاز ہوگیا ہے اور جہاں قومی اور صوبائی اسمبلیوں اور دینی وسیاسی جماعتوں نے اس کے خلاف شدید ردعمل ظاہر کیا ہے، وہاں ایک اہم سیاسی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی کے ذمہ دار راہ نما شاہ محمود قریشی نے یہ کہہ کر ناموس رسالت کے حوالے سے مسلمانوں کے دینی جذبات اور ان کے عقیدہ وایمان کے خلاف مورچہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے کہ ''یہ برطانیہ کا داخلی معاملہ ہے۔'' اگرچہ برطانوی وزیر خارجہ نے سلمان رشدی کوسر کا خطاب دینے کے فیصلے پر قائم رہتے ہوئے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہونے پر ان سے معذرت کر کے پنجابی محاورہ کے مطابق ''گونگلواں توں مٹی جھاڑن'' (شلجم پر سے مٹی جھاڑنے) کی کوشش کی ہے، لیکن اس سے جس بحث کا آغاز ہوگیا ہے، وہ اب ہمارے خیال کے مطابق چلتی رہے گی اور اسی سے تحفظ ناموس رسالت کے قانون میں ان ترامیم کی راہ ہموار کی جائے گی جس کے لیے ایک عرصہ سے تیاری کی جارہی ہے۔

اس کے ساتھ ایک اور خبر بھی شامل کرلیں جو روزنامہ نوائے وقت لاہور نے ۱۸؍جون ۲۰۰۷ کو شائع کی ہے کہ امریکہ کے بین الاقوامی مذہبی آزادی کمیشن نے پاکستان میں توہین مذہب سے متعلق قانون کے بے جا استعمال پر افسوس کرتے ہوئے اسلام آباد سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ملک میں اسلامی انتہاپسندی کا مقابلہ کرنے کے لیے سنجیدگی سے اقدامات کرے۔ کمیشن نے بش انتظامیہ سے بھی مطالبہ کیا ہے کہ وہ سنگین مذہبی تشویش ناک امور کے بارے میں اسلام آباد کے ساتھ سرگرمی کے ساتھ رجوع کرے۔ کمیشن نے پاکستان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ توہین مذہب کو غیر مجرمانہ قرار دے۔ گویا امریکہ کے بین الاقوامی مذہبی آزادی کمیشن کے نزدیک مذہب اور مذہبی شخصیات کی توہین سرے سے جرائم میں ہی شامل نہیں ہے اور اسے اس بات پر تکلیف ہے کہ جو بات ان کے نزدیک جرم ہی نہیں ہے، پاکستان نے اس کے لیے دفعہ ۲۹۵ کے تحت موت تک کی سزا مقرر کر رکھی ہے۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ حدود آرڈیننس کے بارے میں بھی امریکہ اور مغرب کا موقف یہی تھا کہ ان قوانین کا بے جا استعمال ہورہا ہے اور مغرب کا یہ موقف بھی ڈھکا چھپا نہیں ہے کہ رضامندی کا زنا سرے سے جرم نہیں ہے، چنانچہ اسی پس منظر میں حدود قوانین کے غلط استعمال کے پراپیگنڈا سے

بات شروع ہوئی اور اس سے نام نہاد ''تحفظ حقوق نسواں ایکٹ'' کی صورت میں جو نتائج حاصل کیے گئے، وہ سب کے سامنے ہیں اور اب یہی کھیل تحفظ ناموس رسالت کے قانون کے ساتھ کھیلا جانے والا ہے۔

دوسری طرف ہماری صورت حال یہ ہے کہ حدود آرڈیننس کے تحفظ میں واضح ناکامی کے بعد بھی ہم اسی پرانی ڈگر پر قائم ہیں اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ ہمارے نزدیک حدود آرڈیننس کے حوالے سے دینی حلقوں کی پسپائی کے دو واضح اسباب ہیں۔ایک یہ کہ ہم نے ''میڈیا وار'' کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور اس معرکہ میں صرف ''منبر و محراب'' پر قناعت کر لی۔ہم اس فرق کو محسوس نہیں کر سکے کہ منبر و محراب کے ماحول میں کی جانے والی بات صرف ان لوگوں تک پہنچتی ہے جو خود وہاں تک چل کر آتے ہیں اور مجموعی آبادی میں ان کا تناسب معلوم کرنا مشکل نہیں ہے، جبکہ الیکٹرانک میڈیا کی رسائی کم و بیش ہر پاکستانی کے ''بیڈروم'' تک ہے۔ہم نے یہ جنگ، جو دراصل ''میڈیا وار'' تھی، کلاشنکوف کے مقابلے میں تلوار کے ساتھ لڑنے کی کوشش کی ہے جس کا نتیجہ یہی ہونا تھا جو ہمارے سامنے ہے۔

دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ ہم اس جدوجہد کے لیے ''کل جماعتی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت'' کی طرز کا کوئی ایسا دینی محاذ قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے جو اقتدار اور اپوزیشن کی سیاست سے الگ تھلگ رہتے ہوئے ایک دینی اور ملی مسئلے کے طور پر قوم کے اجتماعی جذبات کی ترجمانی اور اس کی قیادت کر سکے۔ ہماری معلومات کے مطابق ایک الگ دینی محاذ کی تشکیل میں متحدہ مجلس عمل کے تحفظات آڑے آئے، لیکن متحدہ مجلس عمل کی قیادت نہ خود اس مسئلے کو صحیح طور پر ڈیل کر سکی اور نہ ہی اس نے اس کے لیے الگ دینی محاذ کے قیام کا راستہ دیا اور ایم ایم اے کے تحفظات کی دھند میں حدود آرڈیننس کا تیاپانچہ ہو گیا۔

ہمارے نزدیک ''لال مسجد'' کا قضیہ بھی اسی صورت حال کا ردعمل ہے۔لال مسجد کے طریق کار سے ہمیں بھی اختلاف ہے اور ہم ان کالموں میں عرض کر چکے ہیں کہ جو کچھ لال مسجد کر رہی ہے، بروقت مشاورت کی صورت میں وہ سب کچھ اس سے کہیں بہتر صورت میں کیا جا سکتا تھا۔ہم نے

لال مسجد کے طریق کار کو کھلے بندوں غیر دانش مندانہ اور دینی جدوجہد کے لیے نقصان دہ قرار دیا ہے اور سمجھتے ہیں، لیکن یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ بھی دراصل اسی طرز عمل کا نتیجہ اور ردعمل ہے کہ ہماری دینی سیاسی قیادت خالصتاً دینی معاملات میں نہ خود دینی حلقوں کے جذبات اور دینی جدوجہد کے تقاضوں کی صحیح طور پر نمائندگی اور ترجمانی کر پاتی ہے اور نہ ہی ان تقاضوں اور جذبات کے الگ طور پر اظہار کی کوئی الگ صورت اس کے لیے قابل قبول ہوتی ہے جو ہماری ماضی کی روایات کے بھی خلاف ہے، اس لیے کہ حضرت مولانا مفتی محمود نے ہمیشہ ایسے دینی محاذوں کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی فرمائی ہے۔

ہمارے نزدیک سلمان رشدی کو سر کا خطاب دینے کی بات بھی بہت اہم ہے اور مسلمانوں کے دینی جذبات کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن امریکہ کے مذہبی آزادی کمیشن کی طرف سے مذہب اور مذہبی شخصیات کی توہین کو جرائم کی فہرست سے نکال دینے کی ''وارننگ'' اس سے کہیں زیادہ سنگینی کی حامل ہے اور اگر اب بھی ہم اپنی حکمت عملی اور ترجیحات پر نظر ثانی کے لیے تیار نہیں ہیں تو خاکم بدہن اس محاذ پر بھی پسپائی کے سوا کچھ حاصل ہونے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائیں، آمین ثم آمین۔

(روزنامہ اسلام،

مذہبی شدت پسندی، حکومت اور دینی سیاسی جماعتیں

جامعہ حفصہ اور لال مسجد اسلام آباد کے خلاف سرکاری فورسز کے مسلح آپریشن نے پورے ملک کو دہلا کر رکھ دیا ہے۔ ایک عرصہ سے مختلف حلقوں کی طرف سے یہ کوشش جاری تھی کہ کسی طرح یہ تصادم رک جائے اور خونریزی کا وہ الم ناک منظر قوم کو نہ دیکھنا پڑے جس نے ملک کے ہر فرد کو رنج و صدمہ کی تصویر بنا دیا ہے، لیکن جو ہونا تھا وہ ہوا، بہت برا ہوا اور بہت برے طریقے سے ہوا۔ اس سے کچھ لوگوں کو ضرور تسکین حاصل ہوئی ہوگی جو حکومت کی رٹ بحال کرنے کے ساتھ ساتھ دہشت اور رعب و دبدبہ مسلط کرنا بھی ضروری سمجھ بیٹھے تھے اور ان کا خیال تھا کہ طاقت اور اسلحہ کا بے دریغ استعمال کیے بغیر اور آگ اور خون کا کھیل کھیلے بغیر شاید حکومت کی رٹ کا وقار قائم نہیں رہے گا۔ چند افراد ضرور ایسے ہوں گے، لیکن بحیثیت مجموعی پوری قوم غم زدہ ہے، افسردہ ہے، مضطرب اور بے چین ہے کہ بہت سے بے گناہوں کے لاشے تڑپے ہیں، بچوں اور عورتوں کا خون بہا ہے اور یہ سب کچھ اللہ کے گھر میں ہوا ہے اور ایک دینی درس گاہ میں ہوا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ایک سرکاری چلڈرن لائبریری پر جامعہ حفصہ کی طالبات کے قبضہ کے ساتھ جب اس تنازع کا آغاز ہوا تھا اور اس کے بعد ایک مبینہ قحبہ خانہ اور پھر مساج پارلر کے خلاف کارروائی نے اس معاملہ کو آگے بڑھایا تھا تو ہم نے اسی وقت یہ عرض کر دیا تھا کہ ایک مسلمان ملک کے اندر حکومت وقت کے خلاف اس قسم کے تصادم کے ماحول اور قانون کو ہاتھ میں لینے کی حمایت نہیں کی جا سکتی اور مقاصد کتنے ہی نیک اور اچھے کیوں نہ ہوں، ان کے لیے اس طرز کی جدوجہد کو سند جواز فراہم نہیں کی

جا سکتی۔ اس پر ملک بھر کے جمہور علمائے کرام کا کم وبیش اجماع منعقد ہو گیا تھا، مگر اس کی پروا کیے بغیر معاملات کو اسی رخ پر آگے بڑھانے کا سلسلہ جاری رہا۔

دوسری طرف ملک کی سنجیدہ دینی قیادت نے حکومت پر مسلسل زور دیا کہ وہ طاقت کے استعمال سے گریز کرے، جائز مطالبات منظور کرنے کی طرف توجہ دے، ان اسباب وعوامل کو دور کرنے کی کوشش کرے جن کے ردعمل میں شدت کی یہ صورت سامنے آئی ہے اور مذاکرات کے ذریعے سے مسئلے کو حل کرنے کا راستہ نکالے، لیکن حکومت نے بھی اس کے لیے سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا اور اس کی غیر سنجیدگی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے ان جائز مطالبات میں سے کسی ایک کو بھی قابل اعتنا نہیں سمجھا جن کی بنیاد پر لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی انتظامیہ شدت کی اس انتہا تک جا پہنچی تھی۔

ہمیں اس بات سے اتفاق ہے کہ اگر حکومت اسلامی نظام کے نفاذ، اسلام آباد میں گرائی جانے والی مساجد کو دوبارہ تعمیر کرنے، حدود شرعیہ میں کی گئی ترامیم پر نظر ثانی اور فحاشی کے مبینہ مراکز کو بند کرنے میں سے کسی ایک مسئلے کی طرف بھی سنجیدگی سے متوجہ ہو جاتی تو اس سلسلے میں لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی انتظامیہ کے رویے میں پائی جانے والی شدت کو کم کیا جا سکتا تھا اور ہم لال مسجد کے خطیب مولانا عبد العزیز کی اس بات سے بھی متفق ہیں جس میں انھوں نے کہا تھا کہ ہمارے طریق کار سے اختلاف کرنے والے ان جائز مطالبات کے لیے صحیح طریق کار سے جدوجہد کیوں نہیں کرتے؟ مولانا عبد العزیز اور غازی عبد الرشید شہید کے طریق کار سے ہم نے بھی اختلاف کیا تھا اور اب بھی ہم اسے غلط ہی سمجھتے ہیں کہ ایک مسلمان ملک میں حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانا، قانون کو ہاتھ میں لینا اور مسلح تصادم کا ماحول پیدا کرنا ہمارے نزدیک شرعاً اور اخلاقاً کسی بھی لحاظ سے درست نہیں ہے، لیکن مولانا عبد العزیز کے اس سوال کا آخر کیا جواب ہے کہ ان کے طریق کار سے اختلاف کرنے والوں نے ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ اور فحاشی ومنکرات کے سدباب کے لیے صحیح طریق کار پر مبنی کون سی جدوجہد کا اہتمام کیا ہے؟ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ معاملات کو اس رخ تک پہنچانے میں جہاں اسلامی نظام کے معاملے میں حکومت کی سرد مہری کارفرما ہے، وہاں اسلامی

نظام کے لیے جدوجہد کی داعی دینی سیاسی جماعتیں بھی اس کی ذمہ دار ہیں کہ ان کی بے عملی اور تغافل نے وہ خوف ناک خلا پیدا کر دیا ہے جس کو پر کرنے کے لیے تشدد اور بغاوت کی تحریکات آگے بڑھ رہی ہیں اور یہ قانون فطرت ہے کہ خلا جس قدر گہرا ہو، اس کی جگہ لینے والی قوتیں اسی قدر شدت اور تیزی کے ساتھ لپکتی ہیں اور بسا اوقات آندھی اور طوفان کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہیں۔

جہاد افغانستان کے بعد یہ بات حکومت اور دینی سیاسی جماعتوں، دونوں سے توجہ کی طالب تھی کہ جن ہزاروں افراد نے پاکستان سے جا کر افغانستان میں روسی استعمار کے خلاف عملی جنگ لڑی ہے، وہ صرف اسلحہ چلانے کا ہی عملی تجربہ نہیں رکھتے بلکہ اسلام کی بالادستی اور نفاذ اسلام کے مخلصانہ جذبے سے بھی سرشار ہیں۔ ان کی تعداد سینکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہے اور وہ ملک کے ہر حصے میں موجود ہیں۔ انھیں ملک وقوم کا قیمتی اثاثہ سمجھتے ہوئے نہ حکومت نے ان کے جذبات و رجحانات کو اسلام اور پاکستان کے لیے مثبت رخ پر قائم رکھنے کی کوئی پالیسی اپنائی اور نہ ہی دینی سیاسی جماعتوں نے انھیں اپنانے اور اپنی جدوجہد میں شریک کرنے کی طرف توجہ دی بلکہ انھیں اپنا حریف اور اپنے لیے خطرہ تصور کیا گیا اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کے لیے جو نیا ماحول کھڑا کیا گیا، وہ ان کی کردار کشی، توہین، طنز واستہزا، اور تحقیر وحوصلہ شکنی سے عبارت تھا۔ پھر اس فضا میں ان کے سامنے افغانستان میں امریکی فوجیں اتریں، طالبان کی حکومت کو قوت کے ساتھ تہس نہس کر دیا گیا اور پاکستان میں دینی شعائر اور اسلامی روایات واقدار کو پامال کرنے کی پالیسیاں آگے بڑھنے لگیں تو ان کا غصہ اور نفرت اپنی انتہا کو پہنچ گئے اور وہی غصہ ونفرت مجتمع ہو کر لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں حکمرانوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

ہم نے حکومت وقت کے ساتھ مولانا عبدالعزیز اور غازی عبدالرشید کے تصادم اور محاذ آرائی کے طرز عمل کو غلط قرار دیا ہے اور فی الواقع اسے غلط سمجھتے ہیں اور ہمیں اس بات کا بھی شدید دکھ ہے کہ ان بھائیوں نے حکومت کے ساتھ ساتھ خود اپنی دینی وعلمی قیادت سے بھی بغاوت کی اور ان کی مشاورت وہدایات کو قبول نہ کیا، لیکن اس کا یہ پس منظر بھی ہمارے سامنے ہے کہ اسلامی نظام اور دینی شعائر واقدار کے بارے میں حکومتی حلقوں اور اداروں کی منافقانہ پالیسی کا آخری جذباتی ردعمل یہی

ہوسکتا تھا اور غازی برادران کے دل میں یہ بات یقین کے درجے میں بیٹھ چکی تھی کہ دینی سیاسی جماعتوں نے اپنے لیے معروضی سیاست اور اقتدار کی اکھاڑ پچھاڑ کو ہی آخری منزل سمجھ لیا ہے اور ان سے نفاذ اسلام کے لیے کسی موثر جدوجہد کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

ہمارے نزدیک یہ دو عوامل ہیں جنھوں نے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کو حکومت کے خلاف ایک مسلح مورچہ بنا دیا اور بات لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے خلاف سرکاری آپریشن پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کے بعد ملک بھر میں ہونے والے ہنگاموں اور خودکش حملوں نے لال مسجد کی اس بغاوت کا دائرہ دور دور تک وسیع کر دیا ہے۔ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے کر لیجیے کہ ۱۴ر جولائی کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ سرگودھا میں ایک نوجوان نے بینک ڈکیتی کے دوران میں زخمی حالت میں گرفتار ہونے کے بعد یہ بتایا ہے کہ اس نے بینک پر ڈاکہ اس لیے ڈالا ہے تاکہ رقم حاصل کر کے لال مسجد کا بدلہ لینے اور ملک میں نفاذ شریعت کی جدوجہد منظّم کرنے کے لیے کام کر سکے، یعنی اس نے ملک میں نفاذ شریعت کی جدوجہد کے لیے بینک ڈکیتی کا راستہ اختیار کیا ہے۔ یہ ایک المیہ ہے، بہت بڑا المیہ ہے اور اس قسم کے المیے مایوسیوں سے جنم لیا کرتے ہیں۔ جب لوگوں کو ان کے جائز مطالبات اور جذبات کا صحیح جگہ سے جواب نہیں ملتا تو وہ اس کی تسکین کے لیے متبادل ذرائع اختیار کرتے ہیں اور یہ متبادل ذرائع ضروری نہیں کہ صحیح بھی ہوں۔

پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے جس کا وجود اسلام کی بنیاد پر قائم ہوا تھا اور اس کے دستور میں اسلامی نظام کی عمل داری اور اسلامی معاشرے کے قیام کی ضمانت دی گئی تھی۔ جب ایک مسلم نوجوان اس سلسلے میں حکومت کی سرد مہری اور حکومتی اداروں کا منفی طرزِ عمل دیکھتا ہے تو اس کی نگاہیں بے ساختہ دینی جماعتوں کی طرف اٹھتی ہیں کہ وہ کیا کر رہی ہیں اور حکومتی طرزِ عمل کا رخ تبدیل کرانے کے لیے کس سنجیدگی کے ساتھ مصروفِ عمل ہیں۔ اگر اسے دینی سیاسی جماعتوں کی جدوجہد اور تحریک میں اپنے جذبات کی تسکین کا سامان مل جائے تو وہ وہاں رک جائے گا اور خود کو ان کے حوالے کر دے گا، لیکن اگر اسے وہاں بھی امید کا کوئی پہلو دکھائی نہ دے اور ہر طرف وقتی مفادات اور مصلحتوں کا ہی ماحول ملے تو پھر اس کے لیے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ خاموش ہو کر بیٹھ

جائے اور اسلام کی بالا دستی اور فحاشی و بے حیائی سے معاشرہ کو پاک کرنے کا خیال اپنے ذہن سے نکال دے اور یا پھر اس کے لیے اپنا راستہ خود نکالے اور جو کچھ وہ اس کے لیے کر سکتا ہے، اس کی منصوبہ بندی کرے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ جہاد افغانستان میں حصہ لینے والے ہزاروں نوجوان جو نفاذ اسلام کے مخلصانہ جذبہ سے بہرہ ور ہیں اور اسلحہ کی ٹریننگ بھی رکھتے ہیں، گزشتہ ایک عشرے کے دوران میں اسی تجربے سے گزرے ہیں اور اب وہ اس تجربے کے آخری مرحلے میں ہیں جس کی ایک جھلک لال مسجد میں پوری قوم نے دیکھ لی ہے اور اگر حکومت اور دینی جماعتوں نے اب بھی اس مسئلے کو سنجیدگی کے ساتھ نہ لیا اور ان مخلص اور پر جوش نوجوانوں کے جذبات کو مثبت رخ دینے کی کوئی معقول کوشش نہ کی تو لال مسجد اس قضیہ کی انتہا نہیں ہوگی بلکہ خدانخواستہ ابتدا ثابت ہو سکتی ہے۔

لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے تنازع میں اپنی جانوں کا نذرانہ دینے والے شہدا کے لیے ہم دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت انھیں جوار رحمت میں جگہ دیں۔ ہمیں سرکاری فورسز کے ان نوجوانوں سے بھی گہری ہمدردی ہے جنھوں نے اپنی جانیں پیش کیں۔ وہ ڈیوٹی پر تھے اور فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ رب العزت تمام شہدا کو جوار رحمت میں جگہ دیں، زخمیوں کو صحت عطا فرمائیں، پس ماندگان کو صبر جمیل سے نوازیں اور ہم سب کو بحیثیت قوم اس سانحہ سے سبق حاصل کرتے ہوئے اپنی غلطیوں کی اصلاح کے ساتھ ملک وقوم کے مستقبل کی بہتر صورت گری کی توفیق دیں۔ آمین یا رب العالمین۔

(۱۷ جولائی ۲۰۰۷)

مجلس عمل اور جمعیۃ علماء اسلام کی داخلی دھڑے بندی

حضرت صاحب زادہ پیر عبد الرحیم نقشبندی صاحب گزشتہ دنوں اپنے بعض رفقا سمیت گوجرانوالہ تشریف لائے اور جمعیۃ علماء اسلام (سمیع الحق گروپ) میں نئے خلفشار کے حوالے سے مجھے کہا کہ میں اس سلسلے میں کوئی متحرک کردار ادا کروں۔ میں نے ان سے گزارش کی کہ میں جمعیۃ علماء اسلام کا مسلسل رکن ہوں اور تاحیات اسی جماعت میں رہنا چاہتا ہوں، لیکن اس میں کوئی عملی اور متحرک کردار ادا کرنا بوجوہ میرے بس میں نہیں ہے۔ مجھ سے دریافت کیا گیا کہ میں جمعیۃ کے مختلف دھڑوں میں سے کس میں ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت مولانا مفتی محمود قدس اللہ سرہ العزیز کی وفات کے بعد جب جمعیۃ دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی تو میں حضرت الامیر مولانا محمد عبد اللہ درخواستی قدس اللہ سرہ العزیز کے ساتھ تھا اور اس کے بعد جتنے اتار چڑھاؤ ہوئے، میں انھی کے ساتھ رہا حتیٰ کہ ان کی وفات کے وقت بھی میں انھی کے ساتھ تھا اور اب بھی بحمد اللہ تعالیٰ اسی کیفیت میں ہوں۔

جمعیۃ علماء اسلام کا قیام اختلاف کی بنیاد پر عمل میں آیا تھا اور اس کے بعد سے اب تک علماء حق کی یہ جماعت اختلافات کے مختلف ادوار سے گزرتی ہوئی موجودہ مقام تک پہنچی ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے جب جمعیۃ علماء ہند نے متحدہ ہندوستان کی تقسیم کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کیا اور قیام پاکستان کی تحریک کا ساتھ دینے کے بجائے کانگریس کی حمایت کا اعلان کر دیا تو جمعیۃ علماء ہند میں شامل ان بزرگوں نے جمعیۃ علماء اسلام کے نام سے الگ جماعت قائم کر لی جو پاکستان کے قیام

کی تحریک کا ساتھ دینے کو ضروری سمجھتے تھے اور اس میں کردار ادا کرنا چاہتے تھے۔ اس جمعیۃ کے سربراہ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی چنے گئے جبکہ جمعیۃ علماے ہند کے سربراہ اس وقت حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی تھے۔ دونوں بزرگ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مایہ ناز شاگردوں میں سے تھے اور دارالعلوم دیوبند کے روشن ستارے تھے۔

حضرت عثمانی نے اپنے رفقا سمیت تحریک پاکستان کی حمایت میں بھرپور کردار ادا کیا، مگر قیام پاکستان کے بعد یہ جماعت سیاسی طور پر متحرک نہ رہ سکی۔ دستور ساز اسمبلی میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کے خطابات اور قرارداد مقاصد کے لیے ان کی جدوجہد نے قومی حلقوں میں جمعیۃ علماے اسلام کی آواز کو زندہ رکھا، مگر عوامی حلقوں میں وہ ایک منظّم جماعت کا روپ نہ دھار سکی۔

اس وقت اس جماعت کے اکابر میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع، حضرت مولانا اطہر علی، حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی، حضرت مولانا مفتی محمد حسن امرتسری اور حضرت مولانا محمد متین خطیب جیسے بزرگ نمایاں تھے جبکہ دوسری طرف پاکستان میں جمعیۃ علماے ہند سے وابستہ جو حضرات موجود تھے، انھوں نے ''جمعیۃ علماے پاکستان'' کے نام سے منظّم ہونے کا ارادہ کیا اور اس مقصد کے لیے حضرت مولانا محمد صادق آف کھڈہ کراچی، حضرت مولانا سید گل بادشاہ صاحب آف سرحد، حضرت مولانا عبدالحنان ہزاروی، حضرت مولانا مفتی عبدالواحد آف گوجرانوالہ اور حضرت مولانا مفتی ضیاء الحسن صاحب آف ساہیوال نے ''جمعیۃ علماے پاکستان'' قائم کرنے کا باضابطہ فیصلہ بھی کر لیا مگر اس وقت کے سیاسی حالات میں یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔

حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی کی وفات کے بعد ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ دونوں جمعیتوں سے تعلق رکھنے والے بزرگوں نے جمعیۃ علماے اسلام کے پلیٹ فارم پر کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس موقع پر شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری کو جمعیۃ کا امیر اور حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کو ناظم اعلیٰ منتخب کیا گیا مگر یہ بات بھی عملی طور پر آگے نہ بڑھ سکی تا آنکہ ۱۹۵۶ء میں حضرت مولانا مفتی محمود کی دعوت پر ملتان میں منعقد ہونے والے ایک ملک گیر علما کنونشن میں ''جمعیۃ علماے اسلام مغربی پاکستان'' کو عوامی سطح پر منظّم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور ملکی سیاسیات میں بھرپور کردار ادا کرنے کا اعلان

کیا گیا۔حضرت مولانا احمد علی لاہوری کو جمیعۃ کا امیر اور حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی کو ناظم اعلیٰ منتخب کیا گیا جبکہ اس کے مرکزی راہ نماؤں میں حضرت مولانا مفتی محمود، حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی، حضرت مولانا محمد یوسف بنوری اور حضرت مولانا علامہ شمس الحق افغانی جیسے سرکردہ بزرگ شامل تھے۔ دوسری طرف مشرقی پاکستان میں جمیعۃ علماے اسلام سے تعلق رکھنے والے بہت سے بزرگ سابق وزیراعظم چودھری محمد علی مرحوم کی قائم کردہ ''نظام اسلام پارٹی'' میں شامل ہو گئے اور مغربی پاکستان میں اس حلقہ کے بزرگوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات سے قبل جب مسٹر ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگایا تو ملک کی انتخابی سیاست دائیں بازو اور بائیں بازو کے دو واضح کیمپوں میں تقسیم ہو گئی اور انتخابی مہم کا بازار گرم ہوا تو حضرت درخواستی، حضرت مولانا مفتی محمود اور حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی کی قیادت میں کام کرنے والی جمیعۃ علماے اسلام چونکہ جمیعۃ علماے ہند کی فکری جانشین تھی جس کی گھٹی میں استعمار دشمنی اور سرمایہ درانہ وجاگیردارانہ نظام کی مخالفت شامل ہے، اس لیے ان راہ نماؤں نے دائیں بازو کی جماعت کے طور پر کام کرنے سے انکار کر دیا اور ''اسلامی سوشلزم'' کے حامیوں پر لگائے جانے والے کفر کے فتوے کی مخالفت کی۔اس فضا میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع اور حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کی سربراہی میں جمیعۃ علماے اسلام کے پرانے بزرگوں نے از سر نو منظّم ہونے کا فیصلہ کیا اور ''مرکزی جمیعۃ علماے اسلام'' کے نام سے جماعت بنا کر دائیں بازو کی سیاست میں متحرک ہو گئے جبکہ تقابل کی اس فضا میں پہلی جمیعۃ ''ہزاروی گروپ'' کے عنوان سے موسوم ہو گئی۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں ہزاروی گروپ نے قومی اسمبلی، سرحد اسمبلی اور بلوچستان اسمبلی میں نمائندگی حاصل کر لی اور ملک کی اہم سیاسی جماعتوں میں اس کا شکار ہونے لگا۔اس دوران میں سقوط ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا عظیم سانحہ پیش آیا جس کے بعد مرکزی جمیعۃ علماے اسلام نے پھر خاموشی اختیار کر لی اور میدان میں وہی جمیعۃ رہ گئی جس کی قیادت حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی، حضرت مولانا مفتی محمود اور حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی کر رہے تھے، لیکن مشرقی

پاکستان کی علیحدگی کے بعد باقی ماندہ پاکستان میں مستقبل کے سیاسی نقشہ اور اس میں جمعیۃ کے کردار کے تعین کے مسئلے پر حضرت مولانا مفتی محمود اور حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی کے رجحانات الگ الگ ہو گئے جو جمعیۃ کی ایک نئی تقسیم کا عنوان بن گئے۔ حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی مسٹر بھٹو مرحوم کے ساتھ سیاسی رفاقت کے حق میں تھے اور حضرت مولانا مفتی محمود بھٹو مرحوم کے خلاف اپوزیشن کو منظم کرنے اور اس میں بھرپور کردار ادا کرنے کو ضروری سمجھتے تھے، اس لیے دونوں کے راستے الگ ہو گئے اور حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی نے الگ جمعیۃ بنا لی جس میں حضرت مولانا عبد الحکیم اور حضرت مولانا ضیاء القاسمی ان کے ساتھ تھے جبکہ حضرت درخواستی، حضرت مولانا عبید اللہ انور، حضرت مولانا سید گل بادشاہ اور ملک بھر کے دیگر بزرگ علما حضرت مفتی صاحب کے ساتھ رہے۔

اختلافات کا یہ سلسلہ حضرت مولانا ہزاروی کی وفات تک قائم رہا، لیکن اس دوران میں ۷۷ء کے انتخابات اور تحریک نظام مصطفیٰ میں حضرت مولانا مفتی محمود کی قیادت نے جمعیۃ علماے اسلام کو اور زیادہ سیاسی استحکام بخشا اور ملک بھر میں دیوبندی علماے کرام کی بھاری اکثریت اس کے ساتھ وابستہ ہو گئی، مگر حضرت مفتی صاحب کی وفات کے بعد جمعیۃ علماے اسلام ایک اور تقسیم سے دوچار ہو گئی۔ اس بات وجہ اختلاف یہ بنی کہ حضرت مولانا سید حامد میاں، حضرت مولانا خان محمد مدظلہ، حضرت مولانا سید محمد شاہ امروٹی اور ان کے ساتھ بہت سے دوسرے بزرگ مولانا فضل الرحمٰن کو حضرت مولانا مفتی محمود کی جگہ جمعیۃ کا سیکرٹری جنرل منتخب کر کے ایم آر ڈی کے عنوان سے پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ سیاسی اتحاد میں شامل ہونا چاہتے تھے، مگر حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی اور ان کے بہت سے رفقا حضرت مولانا عبید اللہ انور کو جمعیۃ کا سیکرٹری جنرل بنا کر ایم آر ڈی سے الگ رہنا چاہتے تھے۔ اس مسئلے پر جمعیۃ دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ ایک درخواستی گروپ کہلایا اور دوسرا فضل الرحمٰن گروپ کے نام سے موسوم ہوا۔ میں اس تقسیم میں حضرت درخواستی کے ساتھ تھا اور اس گروپ کا ایک متحرک کردار تھا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، حتیٰ کہ ایم آر ڈی تحلیل ہو گئی تو ۱۹۹۰ء میں حضرت درخواستی اور مولانا فضل الرحمٰن میں مصالحت ہو گئی اور حضرت درخواستی کو متحدہ جمعیۃ کا امیر اور مولانا فضل الرحمٰن

کوسیکرٹری جنرل چن لیا گیا۔اس وقت درخواستی گروپ کے سیکرٹری جنرل مولانا سمیع الحق تھے جنھوں نے اس مصالحت کوقبول کرنے سے انکار کر دیا اور ''سمیع الحق گروپ'' کے نام سے الگ جمعیۃ قائم کر لی اور یہ تقسیم اب تک چلی رہی ہے بلکہ مولانا محمد اجمل قادری نے ''قادری گروپ'' کے نام سے الگ گروپ بنا رکھا ہے اور اب حضرت صاحب زادہ پیر عبدالرحیم نقشبندی ''جمعیۃ علماے اسلام سینئر گروپ'' کے نام سے ایک نئے گروپ کی تشکیل کے لیے متحرک ہیں۔

اس دوران میں ایک اور کوشش بھی ہوتی رہی جس کا مقصد ''درخواستی گروپ'' کی دوبارہ تشکیل تھا۔راقم الحروف نے جب حضرت مولانا فداء الرحمٰن درخواستی مدظلہ کے ساتھ مل کر ایک ایسے فورم کے قیام کے لیے کوشش شروع کی جو جمعیۃ علماے اسلام کے اندر رہتے ہوئے اقتدار اور گروپ بندی کی سیاست سے بالاتر ہو کر نفاذ اسلام کے لیے صرف علمی وفکری کوششوں کو منظم کرتو ہمارے بہت سے قابل احترام بزرگوں کا اصرار تھا کہ ہم ''جمعیۃ علماے اسلام درخواستی گروپ'' کے نام سے کام کریں۔اس پر لاہور، خان پور، کراچی اور راول پنڈی میں متعدد اجلاس ہوئے مگر ہم نے دوٹوک فیصلہ کر لیا کہ جمعیۃ علماے اسلام کے نام سے کسی نئے دھڑے کا اضافہ نہیں کریں گے اور گروہ بندی اور انتخابات کی سیاست سے الگ تھلگ رہتے ہوئے اسلامائزیشن کے لیے جس حد تک ہمارے بس میں ہوا،علمی وفکری کام کریں گے۔چنانچہ ہم اسی لائن پر چل رہے ہیں اور سست رفتاری کے باوجود اپنے کام اور طرز عمل پر مطمئن ہیں۔

یہ طویل داستان رقم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جمعیۃ علماے اسلام اپنے قیام سے لے کر اب تک اس قسم کے بحرانوں سے مسلسل گزرتی آ رہی ہے اور آئندہ بھی ایسا ہوتا رہے گا،اس لیے اصل بات گروہ بندی کی نہیں بلکہ اہداف اور مقاصد کی ہے۔میں نے حضرت صاحب زادہ پیر عبدالرحیم نقشبندی سے عرض کیا ہے کہ جہاں تک ان کے اس موقف کا تعلق ہے کہ موجودہ حالات میں متحدہ مجلس عمل کو باقی رہنا چاہیے اور اسے کسی طرح نقصان نہیں پہنچانا چاہیے، میں اس کی تائید کرتا ہوں اور خود میرا موقف بھی یہی ہے کہ اس وقت عالمی اور ملکی سطح پر اہل دین جس ہمہ گیر آزمایش کا شکار ہیں، اس فضا میں متحدہ مجلس عمل کا موجود رہنا اور متحرک وفعال رہنا انتہائی ضروری ہے۔اس کی

قیادت سے جو اختلاف بھی ہو، اسے مجلس عمل کے اندر رہ کر دور کرنا چاہیے اور اس مشترکہ پلیٹ فارم کو بہرصورت باقی رکھنا چاہیے کیونکہ یہ قومی سیاست کے حوالے سے ملک کے دیندار مسلمانوں کی آخری امید ہے۔ اگر یہ بھی دم توڑ گئی تو قومی سیاست میں دین کے حوالے سے بات کرنا اور دین کی نمائندگی کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جائے گا، اس لیے موقف کی حد تک میں ان کے ساتھ ہوں، لیکن جمعیۃ علماے اسلام میں دھڑے بندی کے حوالے سے کسی سطح پر کوئی کردار ادا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں بلکہ میری دلی خواہش ہے کہ مولانا سمیع الحق اور مولانا میاں محمد اجمل قادری بھی جمعیۃ کے الگ الگ دھڑوں پر اصرار کرنے کے بجائے ''مین اسٹریم'' کو مضبوط کرنے کا راستہ اختیار کریں کیونکہ قومی سیاست میں دینی رجحانات کی موثر نمائندگی کے لیے ایسا کرنا اب زیادہ ضروری ہو گیا ہے اور اس کو نظر انداز کرنا مستقبل کے بڑھتے ہوئے خطرات سے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے کے مترادف ہوگا۔
